جزیروں کے گیت

سید ضمیر جعفری

مکتبۂ کارواں ایبک روڈ انار کلی لاہور

جزیروں کے گیت

پیاری صوفیہ شورش ۔

خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے ۔ اور ہر قدم
پر کامیابی تمہارے قدم چومے ۔ اور خدا
کرے ایم اے فائنل میں تمہیں شاندار کامیابی ہو ۔

الوداعی پارٹی کے موقعہ پر ۔

صفیہ چوہدری
۲۶ مئی ۱۹۷۵

جزیروں کے گیت

سیّد ضمیر جعفری

مکتبۂ کاروان ایبک روڈ انارکلی لاہور

مطبع : آردو پریس ، لاہور
ناشر : عبدالحمید ایم ۔ اے

[redacted]

قیمت : [redacted]

انتساب

دوسری جنگ عالمگیر کی بات ہے ، میں طویل مدت تک ایک ریگستانی علاقہ میں خاک بسر ہونے کے بعد نئی دھلی کے عظیم الشان فوجی ھیڈ کوارٹرز کے ایک وسیع کمرے میں اپنے ''چیف'' کرنل مجید ملک سے اپنے نئے تقرر کے بارے میں حکم و ھدایات حاصل کر رھا تھا ۔ اُنھوں نے فرمایا :—

''تمہیں جنوب مشرقی ایشیائی کہا ن میں
جانا ھوگا ۔ اُمید ھے کہ یہ خطۂ شاداب
تمہاری شاعری کو بھی سرسبز کر دیگا ۔
چراغ حسن حسرت بھی وھیں ھیں
اور بہت خوش ھیں ۔''

اور واقعی جنوب مشرقی ایشیا کو ھم نے ایک فردوس دل و نگاہ پایا ۔ گیتوں کے اس مجموعہ کو ، جو اس زمانے کی یادگار ھے ، میں دلی تشکر و امتنان کے ساتھ

کرنل مجید ملک

ھی کے نام سے معنون کرتا ھوں ۔

ضمیر جعفری

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ترتیب

سر آغاز

ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان کے سانچے میں ڈھالنا بڑا مشکل کام ہے خاص طور پر نظم کا نظم میں اس طرح ترجمہ کرنا کہ خیالات بھی جوں کے توں رہیں اور اندازِ بیان کی شگفتگی اور زبان کی لطافت میں بھی فرق نہ آنے پائے، قریب قریب ناممکن ہے۔ فِٹز جیرَلڈ نے انگریزی زبان میں عمرِ خیام کی رباعیات کا جو ترجمہ کیا ہے یورپ میں اس کی بڑی شہرت ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ فٹز جیرلڈ نے کہیں کہیں تو خیام کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں دیکھا ہے کہ رباعی کا مضمون انگریزی کے سانچے میں نہیں ڈھل سکتا۔ وہاں اصل سے قطع نظر کر کے خود ایک رباعی تصنیف کر ڈالی ہے۔ فٹز جیرلڈ اصل میں رباعیات عمر خیام کا مُترجم نہیں، بلکہ خیام کا مِتّبع ہے۔ خیالات کا تانا بانا اس نے خیام ہی سے لیا ہے۔

لیکن بُنت اپنی ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ بول تو وہ نہیں، ہاں دُھن وہی ہے۔

ایک مُلک کے لوک گیتوں کو کسی دوسرے مُلک کی زبان میں منتقل کرنا اس لحاظ سے اور بھی مشکل ہے کہ اُن پر مُلکی خصوصیات کا زیادہ گہرا اثر پڑا ہوُا ہے۔ دیہات کے لوگ اپنے آس پاس جو کچھ دیکھتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ جیسی آب وہوا زمین اور پیداوار ہے، ویسے ہی خیالات ہیں۔ بہت سے مضامین ہیں جو دریاؤں، باغوں، کھیتوں، جنگلوں، پہاڑوں اور صحراؤں نے سجھائے ہیں۔ مثلاً عربی زبان کے گیتوں نے املی اور ارنڈ کی ٹہنیوں، روکھی سوکھی جھاڑیوں، ریت کے ٹیکروں، اونٹوں اور کھجوروں اور اُجڑی ہوئی بستیوں کے تذکرے سے رونق پائی ہے، کیونکہ صحرانشین عربوں کو انہیں چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایرانیوں نے سنبل وریحاں، گل و لالہ، سمن و یاسمن، بلبل و قمری کی داستانوں سے اپنی شاعری کا چمن آراستہ کیا ہے۔ یورپ کے گیتوں میں کشتیوں، جہازوں اور اُن کے بادبانوں، طوفانی راتوں، پرخروش سمندر، اور جان ہار ماہی گیروں کے قصے ہیں جو دلوں میں نشتر گھنگھولتے ہیں۔ پھر اپنے ملک کی طرف آیئے۔ تو یہاں اور ہی عالم نظر آتا ہے۔ جن شاعروں نے کتابی علم کے بل پر شعر کہنا سیکھا ہے۔ اُن کی کائنات یا تو لالہ و گل، بلبل و قمری کی حکائتیں ہیں۔ یا انگریزی کے استعارے اور تشبیہیں جو اُردو کے قالب میں ڈھلنے کے بعد بھی اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن دیہات کے لوگ فطرت کے دھارے کے قریب کھڑے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے۔ وہی دل میں اُترا اور دل سے زبان پر آگیا ہے۔ اس لئے وہ اپنے گیتوں میں کونجوں کی ڈار، کوئل کی کوک۔ پپیہے کی پکار۔ سرسوں کے کھیتوں، لپکتے جھکتے بادلوں، تپتے میدانوں اور درختوں کی

گھنی چھاؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اِس تذکرے سے دل اور زبان دونوں لذت پاتے ہیں۔

کشمیر کا علاقہ ہمارے ملک کے اکثر وبڑے حصّوں سے کئی باتوں میں مختلف ہے۔ آب وہوا میں یہ سرزمین ایران سے بہت ملتی جلتی ہے۔ پھر اُس پر ایران کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔ لیکن کشمیری زبان کے گیتوں میں ایران کا تتبع کہیں نظر نہیں آتا۔ اُن کے ہاں بید مشک کے پھُولنے کا ذکر جگہ جگہ موجُود ہے۔ کیونکہ بید مشک میں پھُول آتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بہار کا پیش خیمہ آگیا۔ شگوفہ بادام کا تذکرہ ہے کہ وہ اس سرزمین کی خاص چیزوں میں سے ہے۔ جس کی کیفیت دیکھنے سے تعلّق رکھتی ہے۔ پھر ناگ راووں یعنی چشموں اور ندیوں کی حکایتیں۔ بھونرے اور نرگس کے عشق کی داستانیں ہیں۔ جنھوں نے اِن گیتوں میں عجب لطافت پیدا کر دی ہے۔ شراب نہیں لیکن سبز چائے ہے کہ شراب کا بدل سمجھی جاتی ہے۔ جام وسبُو نہیں، لیکن سماوار اور پیالے ہیں۔ ساقی نہیں لیکن سماوارچی ہے کہ سماوار کو ہر وقت گرم رکھتا ہے۔

لوک گیتوں پر ملکی خصوصیات کا جو گہرا اثر پڑا ہے۔ اُسے پیشِ نظر رکھا جائے تو ایک ملک کے لوک گیتوں کو کسی دوسرے ملک کی زبان میں منتقل کرنا بہت زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن ایک حیثیت سے دیکھا جائے۔ تو ان لوک گیتوں کا ترجمہ کرنا آسان بھی ہے کیونکہ ان میں نہ پیچ در پیچ استعارے ہیں۔ نہ لفظوں کا ہیر پھیر، نہ تلمیحیں نہ کنائے۔ بلکہ سیدھے سادے خیالات ہیں۔ پاس پاس کی باتیں اور کھلے کھلے مضامین، وہی عشق وجوانی اور فراق ومہجوری کے افسانے جنھوں نے

آنسوؤں کے تابندہ موتیوں سے ضیا پائی ہے۔ وہی دلِ آدم کے درد و کرب اور سوز و تپش کی داستانیں جو صبحِ آفرینش سے ہر ملک اور ہر زمانے میں ایک ہی انداز سے بیان کی جا رہی ہیں۔ مختلف ملکوں کی آب و ہوا، پیداوار، لباس، گفتار، رفتار، رسموں اور اظہارِ خیال کے طریقوں میں بڑا فرق سہی۔ لیکن آنسوؤں کی زبان تو ایک ہے۔ آہوں کی بولی میں تو کوئی فرق نہیں۔ دلوں کے دھڑکنے کا انداز تو ایک جیسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ملکوں کے لوک گیتوں میں ہمیں بڑی ہم آہنگی اور یکسانی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر جن لوگوں نے دیہات میں نشو و نما پائی ہے۔ اور بچپن سے دیہاتی گیت سنتے چلے آئے ہیں۔ جب کسی دوسرے ملک کا کوئی گیت سنتے ہیں، تو انہیں اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سید ضمیر جعفری کو ملائی زبان کے پنتونوں کے ترجمے میں جو کامیابی ہوئی ہے اُس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، یہی آوازیں اُن کے کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ یہی "چنا، ماہیا اور سپاہیا" کے زمزمے تھے کہ مدت تک غزل کے سانچے میں ڈھلتے رہے۔ اور آخرکار پنتون بن کر اُن کے قلم سے ٹپک پڑے۔

پنتون پنجاب کے "ماہیا" اور سرحد کے ٹپہ اور نیم کٹی سے ملتی جلتی صنف ہے۔ ٹپہ اور ماہیا تو ڈیڑھ ڈیڑھ مصرع کے بول ہیں۔ نیم کٹی کے کئی مصرعے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بھی ڈیڑھ مصرع ہی سے شروع ہوتی ہے۔ ماہیا کا پہلا مصرع آدھا ہوتا ہے جسے باعتبارِ معانی دوسرے مصرع سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح نیم کٹی کا پہلا ڈیڑھ مصرع بھی باقی مصرعوں سے کوئی معنوی ربط نہیں رکھتا۔ پنتون کے چار مصرعے ہوتے ہیں۔ لیکن پہلے دو مصرعوں کو باقی مصرعوں سے کبھی تعلق ہوتا ہے

کبھی نہیں ہوتا تاہم اس بے ربطی میں ایک قسم کا ربط ضرور ہے۔ وہی ربط جو الاپ اور بول میں ہے۔ یعنی پنتون کے پہلے دو مصرعے سامع کے ذہن کو آخری دو مصرعوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے تیار کر دیتے ہیں۔

پنتون میں صرف تغزل ہی نہیں کہیں کہیں پند و موعظت بھی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں کوئی تاریخی واقعہ نظم ہو گیا ہے تو اس پر شاہنامۂ فردوسی کے کسی ٹکڑے کا دھوکا ہوتا ہے۔ لیکن بیان میں گھلاوٹ ہے اور زبان میں لوچ۔ الفاظ ایسے سبک ہیں گویا آبدار موتی ہیں کہ ڈھلکتے جاتے ہیں۔ پھر خیالات میں ایچ پیچ نہیں۔ آس پاس کی تشبیہیں ہیں۔ جنہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ کہیں کوئی سماں باندھا ہے۔ تو دو مصرعوں میں اتنا کچھ آگیا ہے۔ جو کئی صفحوں میں بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ملایا اور صرف ایک ملایا ہی نہیں سارا شرق الہند باغِ ہمیشہ بہار ہے۔ جدھر نظر اٹھتی ہے ہریاول ہی ہریاول ہے۔ نہ سردی نہ گرمی نہ خزاں۔ ابھی دیکھا کہ کالی کالی بدلیاں ہتھنیوں کی طرح جھومتی جھامتی چلی آتی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے مینہ برسنے لگا۔ اور گھڑی بھر کے بعد برس کے کھل گیا۔ اب دیکھو تو آسمان پر ابر کا ایک ٹکڑا نظر نہیں آتا۔ . . . . اس ملک کے درختوں، پھولوں اور پھلوں کا یہ حال ہے کہ کہیں اناناس کی جھاڑیاں، کہیں دریان اور مینگوسٹین کے پیڑ۔ کہیں چھالیا، کہیں ناریل اور کہیں خدل کے درخت، کہیں کافور اور دارچینی کے جھنڈ جنگل کے جنگل انہیں درختوں سے بھرے پڑے ہیں۔ پھر کہیں ہاتھیوں کے گلے ہیں کہ جنگلوں میں خوش مستیاں کر رہے ہیں۔ کہیں شیر ہیں کہ نیستانوں میں ڈکار رہے ہیں۔ کہیں گھڑیال ہیں کہ ریتے میں لوٹ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ صبح و شام کے مناظر ہیں

کہ الگ ہی عالم رکھتے ہیں۔ یا تو یہ کیفیت ہے کہ شفق نے اپنا گل رنگ پھریرا لہرایا۔ افق پر آگ کے شعلے بھڑکتے نظر آنے لگے۔ یا پھر یہ عالم کہ دیکھتے دیکھتے آگ کی رنگت پیلی پڑ گئی۔ پگھلے ہوئے سونے کے پہاڑ ہیں کہ افق پر تو بہ تو چھائے ہوئے ہیں۔ لمحہ بھر کے بعد سونے کے پہاڑوں میں سرمئی دھاریاں سی پھوٹیں۔ آسمان سے اتنا کاجل برسا کہ اُس کے نیچے یہ پہاڑ دب کر رہ گئے۔ پنتون کا نگار خانہ انہیں طلسماتی مناظر سے آراستہ ہے۔ شاعر کو مبالغہ آرائی کی کیا ضرورت ہے۔ جو دیکھتا ہے، بے تکلفی سے وہی کہہ دیتا ہے لیکن اس بے تکلفی پہ ہزاروں تکلف نثار، اس سادگی پر لاکھوں بناؤ قربان۔

سیّد ضمیر جعفری نے جو ہمارے ملک کے نوجوان شعرا میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ پنتون جمع کرنے اور انہیں اُردو کا لباس پہنانے میں جس محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے۔ اُس سے وہی لوگ واقف ہیں۔ جو اُن کے ساتھ ملایا میں موجود تھے۔ ریفلز لائبریری سنگاپور میں اس کے متعلق جتنی کتابیں موجود تھیں۔ انہوں نے وہ سب پڑھ ڈالیں۔ انگریزی زبان میں پنتونوں کے جو تراجم ہاتھ آئے، انہیں بھی دیکھا۔ اس پر تسکین نہ ہوئی۔ تو ملایا کے اہلِ علم سے ملے۔ ایک ایک پنتون کے مفہوم کے متعلق گھنٹوں بحثیں ہوتی رہیں۔ خود بھی ملائی زبان میں دسترس پیدا کی ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ کسی دکان پہ کھڑے ہیں۔ دکان دار سے مول تول کر رہے ہیں۔ وہ انگریزی سمجھ سکتا ہے لیکن انھیں اصرار ہے کہ ملائی زبان ہی میں گفتگو کریں گے۔ اس لئے "برپا ہرگا۔ ہرگا برپا" کئے جا رہے ہیں۔ جہاں کوئی فقرہ نہیں سوجھتا۔ وہاں اشاروں سے مطلب ادا کر دیتے ہیں۔

اگرچہ ان کا قیام زیادہ تر سنگاپور ہی میں رہا ہے۔ لیکن پنتونوں کے ترجمے کے

شوق میں انھوں نے ملایا کے اکثر دوسرے مقامات کی سیر بھی کی ہے۔ جوہور پاس تھا۔ اس لئے پانچویں چھٹے وہاں سے ہو آتے تھے۔ دو تین مرتبہ ملاکا بھی گئے کہ یہ شہر ملائی ادب و تہذیب کا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ کوالالمپور، پینانگ وغیرہ کا سفر بھی کیا۔ غرض انھوں نے اس دُھن میں کئی راستے ناپے۔ کئی مسافتیں طے کیں۔ مدّتوں دور افتادہ کمپونگوں میں گھومتے پھرے۔ اور تاروں کی چھاؤں میں کئی راتیں گزار دیں۔ انہیں میں وہ راستے بھی تھے جو باجوؤں اور سارونگوں کے سائے میں سے گزرتے ہیں۔ جہاں شبگوں زلفوں کی اندھیری رات چھائی رہتی ہے۔ اور افشاں کے ستارے چمکتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نظموں کے اس مجموعے میں ملایا کا دل دھڑک رہا ہے اور سیّد ضمیر جعفری کے اپنے دل کی دھڑکنیں بھی اُس سے ہم آہنگ ہیں۔

مجمع الجزائر ملایا میں ساڑھے سات کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اُن سے ہمارا صرف مذہبی تعلق ہی نہیں بلکہ تہذیبی رشتہ بھی ہے۔ یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ اُردو زبان میں اس سرزمین کے متعلق ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ سیّد ضمیر جعفری ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ انھوں نے ملائی شاعری کی مقبول ترین صنف کو اُردو میں منتقل کرکے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کر دی ہے۔

چراغ حسن حسرت

گفتنی و ناگفتنی

"پنٹوُن" (گھبرائیے نہیں اس کی وضاحت آگے آئے گی) کا نام پہلی مرتبہ میں نے ۱۹۴۵ء میں ملایا میں سُنا۔ مگر یہ رُوداد سننے کے لائق ہے۔

اکتوبر کی ایک اُداس بوجھل سی شام تھی۔ ہم چند سپاہی دن بھر کی بے کیف یکسانیت کا جمود توڑنے کے لئے ساحل کی ایک پُر رونق تفریح گاہ "تیران بولان" (چاندنی رات) میں گھوم پھر رہے تھے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اُستوائی سمندروں کے ان طلسمی جزیروں میں، جن کی رنگینی و رعنائی کے افسانے ہم برما کی سرحدوں سے سُن رہے تھے، زندگی کا دھارا کس طرح بہتا ہے، کس رُخ پر بہتا ہے؟؟ یوں بھی ہم سپاہی لوگ اُس طوفانی دور میں "دنوں" سے زیادہ اپنی "راتوں" میں جیتے تھے۔

دن سرکار کا رات ہماری

"تیراں بُولاں" متوسط درجہ کی ایک چھوٹی سی تفریح گاہ تھی۔ صاف ستھرے، روشن سبزہ زاروں میں کچھ ریستوران، کچھ عام دکانیں، جوا کھیلنے کے چند اسٹال، اور ہنستے گاتے ہوئے کچھ اوپرا تھئیٹر وغیرہ پھیلے ہوئے تھے۔ ریستوران اکثر چینی وضع کے تھے جن میں گورے ٹامیوں کے مست و بیخود ہجوم جاپان کی تازہ شکست کی خوشی میں، اُجلی اُجلی، گول مٹول، کٹوراسی چینی لڑکیوں کو گھیرے میں لئے، گھٹیا قسم کی رم اور تیسرے درجہ کی ایک ذلیل سی مقامی بیئر شراب میں ڈوبے جا رہے تھے۔ تھئیٹر بھی چینی انداز کے تھے جن میں بھیانک شکلوں کے ٹھگنے ٹھگنے ایکٹر سروں پر لمبی لمبی رنگ برنگی ٹوپیاں پہنے اور ٹوپیوں سے بھی لمبی ڈاڑھیاں ناف تک لٹکائے عجیب مضحکہ انگیز حرکتیں کر رہے تھے۔ مکالموں کی "چوں چاں چنگ" بھی اگرچہ ہمارے لئے ناقابلِ فہم تھی مگر اس کے ساتھ بھانت بھانت کے جدید و قدیم چینی سازوں، نفیریوں، تاشوں، الغوزوں، باجوں اور گھونگوں کا شور اس قدر بلند اور (ہمارے لئے) بے ہنگم و بے مقصد سا تھا کہ وہاں بیٹھ سکنا بھی مشکل تھا۔ چینی ڈرامہ اگر یہی ہوتا ہے، تو یہ ڈرامہ کم تھا اور شور زیادہ۔

طرب گاہ کا آخری کونا نسبتاً ویران و خاموش تھا۔ ایک ریستوران کے کھلے دالان میں چند ملائی باشندے (اس ملک کے اصل فرزند) بیٹھے، اناس، چائے کافی وغیرہ کے ساتھ مونگ پھلی کے تلے ہوئے ترش مغز چُگ رہے تھے۔ "سارونگ باجوؤں" (ملائی پہناوا) میں گٹھڑی بنی ہوئی یہ دخترانِ ملایا حسن اور ریشم کے جھل مل میں یوں معلوم ہوتی تھیں جیسے بحرالکاہل کے اجنبی جزیروں کے کسی رنگین

خواب کو جسم مل گیا ہو —— یہ ملایا تھا۔ اور ہم نہیں بیٹھ گئے۔ ہم انگلستان کی باہوں سے لپٹا ہوا چین دیکھنے نہیں نکلے تھے۔ ملایا دیکھنے نکلے تھے اور حیران تھے کہ "ملایا" میں آخر "ملایا" کہاں تھا؟ بلکہ مرشد (میجر چراغ حسن حسرت) تو اس عرصہ میں بیتابی کے عالم میں ملایا کو آوازیں بھی دینے لگ گئے تھے۔

کہاں ہے —— ملایا کو آواز دینا۔

ریستوران کے سامنے ہی ایک خاصہ کشادہ گول چبوترہ تھا۔ کوئی تین ساڑھے تین فٹ اونچا۔ چاروں طرف چوبی جنگلے کا سبز ابھرا ہوا حاشیہ۔ چبوترہ گو ویران پڑا تھا مگر شربت، مونگ پھلی، سارونگ باجو وغیرہ سب موضوعات ایک کے بعد ایک ختم کر کے اب ہم اسی چبوترے کے متعلق قیافے لڑا رہے تھے۔ عاشقِ فرنگ ٹوفی (کیپٹن جاوید خٹک) کا خیال تھا کہ یہ چبوترا آرکسٹرا کے واسطے ہوگا جس کی اس اسلامی ریستوران کو توفیق میسّر نہ ہو سکی۔ ماتے (کیپٹن انعام قاضی) کی رائے میں وہاں سے جادو کا پروفیسر تماشا دکھاتا ہوگا۔ ریکسی (کیپٹن ریاض شمیم) نے جسے موقع بے موقع شعر اور مصرعے چسپاں کرنے کا شوق مرض کی حد تک لاحق تھا۔ فوراً فیض کا یہ مصرع ٹھونک دیا ؎

ویراں ہے میکدہ خُم و ساغر اُداس ہیں

نستعلیق و ہوشمند، ماشو (کیپٹن مسعود احمد) جو "قوم" کا "دماغ" سمجھا جاتا تھا، بحث کی اس آوارگی کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ چپکے سے کھسک کر ساتھ کے میز سے عمدہ سگریٹ اور بڑھیا وِسکی کی پیش کش پہ ایک ملائی نوجوان کو پکڑ لایا جو شکل وصورت سے "نواں" (جناب) قسم کا معقول و شائستہ ملائی معلوم ہوتا تھا

"تواں" نے آتے ہی پہلے تو ڈبّے میں سے گھسیٹ کر ایک سگریٹ روشن کیا۔ پھر بلیک اینڈ وائٹ کے ایک ساغر لب ریز سے اپنے حواس روشن کئے اور پھر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں چبوترے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ـــ "یہاں "رونگنگ" ہوگی۔ دس بجے کے بعد"ـــ اور تواں پھر بلیک اینڈ وائٹ پر جھک گئے۔

"رونگنگ ؟" یعنی چہ ؟ مزید جستجو پر معلوم ہوا کہ یہ در اصل ایک مقامی رقص کا نام ہے جس میں عورت، مرد مل کر ناچتے ہیں ـــ اور واقعی دس بجے کیا دیکھتے ہیں کہ سیاہ رامپوری قسم کی ٹوپیاں پہنے ملائی سازندوں کا ایک طائفہ دف، شہنائی اور ڈھولکیں لئے اسی چبوترے میں ایستادہ تھا۔ پھر دف پر چوٹ پڑنے کی دیر تھی کہ خدا معلوم کن خلاؤں میں سے ملائی مرد، عورتوں، نوجوانوں، لڑکیوں کے پرے کے پرے آن نمودار ہوئے۔ اور دیکھتے دیکھتے ریستوران کا پورا دالان، "باجوؤں اور سارونگوں" سے بھر گیا۔ "تیران بولان" کی ساری رعنائی اسی گوشے میں سمٹ آئی۔ قوسِ قزح کے یہ جیتے جاگتے، دھڑکتے مسکراتے رنگ چبوترے کے ارد گرد پھیل گئے۔

اب "رونگنگ" شروع ہوئی۔

دس دس یا بارہ بارہ "جوڑوں" کی ایک ایک ٹولی باری باری چبوترے پر جاتی۔ عورتیں ـــ مردوں کے آمنے سامنے متوازی صف باندھ کر کھڑی ہو جاتیں اور پھر دف اور ڈھولک اور شہنائی کی مست کن تال پر ایک والہانہ رقص شروع ہو جاتا۔ تیلیوں کی طرح تھرکتی، ناچتی، اُڑتی ہوئی نوجوان لڑکیاں جب نوجوان ساتھیوں

کی قطار کو عموداً کاٹتی ہوئی گزرتیں اور کیفیت کے رس میں کھوئے ہوئے نوجوان جب انہیں اپنے بھرپور بازوؤں میں سمیٹ کر بھنبھوڑتے، جھنجھوڑتے اور جکڑ لیتے تو دیکھنے والے بھی مستی و بیخودی کی لہروں میں ڈوب لینے لگتے۔ مدہوشی و سرمستی کا ایک میٹھا میٹھا خمار تھا کہ ساری فضا اس میں ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ شبابِ رقص کی ان مستانہ ساعتوں میں یہ کیفیت تو خیر بآوازِ بلند راشد کا یہ مصرع

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے

گا رہا تھا، حد یہ تھی ماشو ایسا ثقاہت و ذمہ داری میں دبا ہوا شخص بھی تال کے ساتھ ساتھ جھومتے ہوئے گنگناتا جا رہا تھا۔

دل ہی دل میں رقص کر لیتا ہوں، گا لیتا ہوں میں

رونگنگ دراصل ایک مقبول و محبوب دیہاتی رقص تھا جس میں رقص کی کسی خاص تکنیک سے زیادہ جوانی، محبت، فرصت اور سرخوشی کا اظہار ہے۔ وہی محبت، فرصت اور سرخوشی جو ان جزیروں کی زندگی بھی ہے۔

رقص کے ساتھ راگ بھی تھا۔ عورتیں گا رہی تھیں۔ مرد گا رہے تھے۔ کبھی ہم آہنگ و ہم آواز۔ کبھی باری باری، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، لہرا لہرا کر، جھوم جھوم کر۔ بول تو خیر ہماری سمجھ میں کیا آتے مگر لے ضرور دلنشیں تھی۔ بالخصوص نسوانی آوازوں میں سے دل کا درد اور روح کا کرب جس بے ساختگی سے چھن چھن کر باہر آ رہا تھا ـــــ اس درد کو ہم خوب پہچانتے تھے۔ یہ کرب ہمارے دلوں میں اترا جا رہا تھا۔ محبت اپنے اظہار کے لئے کسی زبان کی محتاج نہیں۔ محبت بذاتِ خود ایک عالمگیر زبان ہے۔

نواں جو چبوترے اور رونگنگ پر تھوڑی سی روشنی ڈالنے کے بعد

بلیک اینڈ وائٹ کی بوتل میں ڈھلے جارہے تھے یہاں ایک مرتبہ پھر کام آئے ۔انہوں نے بتایا رقص کے ساتھ ساتھ یہ "پنتوُن" گائے جارہے ہیں۔

پنتوُن؟

اگرچہ ہمارے مہربان تو ان پنتوُن کے بارے میں ہمیں اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکے کہ "پنتوُن" ملایا اور جاوا کے "کمپونگوں" (دیہاتوں) میں عام گائے جاتے ہیں اور نہ اُس وقت ہم ان گیتوں کا مفہوم ہی سمجھ سکتے تھے۔ تاہم آہنگ کی مٹھاس، لہجے کی شیرینی، اسلوب کا رچاؤ، اور الفاظ کی دوڑتی گاتی ہوئی موسیقی دل میں پیوست ہوتی جارہی تھی۔ دو بجے کے قریب اُس رات جب ہم لوگ وہاں سے اُٹھے تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے حواس پر شہد و شراب کی ملی جُلی بوندیں گر رہی ہوں جیسے کانوں کے راستے دلوں نے آج ایک عجیب لذّت پی لی تھی ـــ کیمپ میں پہنچنے کے بعد بھی دیر تک "پنتوُنوں" کا تذکرہ ہوتا رہا۔

مرشد کی رائے تھی کہ اتنے پیارے الفاظ اور اتنے دل آویز اسلوب کے پردے میں اگر خیال و معنی کی روح بھی اتنی ہی پیاری ہوتی تو ان پڑھوں کی اس شاعری کے سامنے بڑے بڑے جغادری ملکوں کا ادب پیلا پڑ جائے گا۔ بلکہ، اس کے بعد ہماری بارکوں میں جب کبھی "محفلِ فرانیاں" گرم ہوتی اور رکیسی حسبِ عادت کوئی شعر پڑھنے لگتا تو مرشد فوراً دونوں ہاتھوں سے اُس کا منہ بند کرتے ہوئے، کہا کرتے ـــ "رہنے دو۔ میرے بھائی رہنے دو۔ کسی پیتیمہ کو بلاؤ جو "تنگی تنگی بنگی ہاری" کی شراب برسائے" ـــ اور پھر اپنی گھنی گنجان مونچھوں میں سے شربتِ روح افزا کی نمی نچوڑتے ہوئے فرماتے ـــ "ارے صاحبزادے، اس "ساکی لامہ آپا نامہ"

کا جواب کہاں سے لاؤ گے ؟ اللہ اللہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے حسرت موہانی کے بعض جوان شعروں کو شراب میں لگا دیا گیا ہے۔"

"پنتون" سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

رفتہ رفتہ جب ملایا اور جاوا۔ دوسرے جزائر اور ان شاداب جزیروں میں پھیلی ہوئی خوبصورت زندگی کے اندر جھانکنے کا موقع ملا اور ملائی زبان میں ذرا دسترس پیدا ہوئی تو میں نے اِس خطّے کے ادبی سرمائے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر گونہ تعجب ہوا کہ اعلیٰ اور معیاری طبعزاد ادب کا وہاں سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔ نثر کی کتابوں میں قدیم ہندی، مصری، عربی، اور ایرانی کہانیوں مثلاً رامائن (حکایاتِ سری راما) مہابھارت، طوطی نامہ، گل بکاؤلی، داستانِ امیر حمزہ، کلیلہ دمنہ، حکایاتِ شاہِ مرداں، محمد حنفیہ، الف لیلیٰ وغیرہ کے تراجم ملتے تھے۔ مقامی تخلیقات میں بھی بیشتر مواد اسی ڈھب کا تھا۔ وہی طلسم ہوشربا قسم کی طول طویل، بعید از عقل و قیاس فرضی داستانیں (مثلاً حکایاتِ راجہ پاسی) البتہ "شجرہ ملایو" کے نام سے ایک کتاب جو ۱۵۱۰ء میں لکھی گئی ہے اور جو اگرچہ ادب سے زیادہ تاریخ کی تصنیف ہے، اپنے دلچسپ طرزِ بیان، زندگی کے عمیق مشاہدے اور اس کے فن کارانہ اظہار کی وجہ سے ملایا کے معیاری ادب کی ایک نمائندہ بلکہ بلاشبہ بہترین تصنیف ہے۔ مرشد، "شجرہ ملایو" کو ملایا کا "فسانۂ آزاد" کہا کرتے تھے۔

"شجرہ ملایو" کے بعد ملایا کے ادبی میدان میں دو صدی کا طویل بیابان پھیلا ہوا ہے۔ جس کے بعد سترھویں صدی کے آخر میں ایک شخص عبداللہ بن عبدالقادر

نے عصری تاریخ کے کچھ خاکے اور تذکرے لکھے ہیں۔ جن میں زیادہ تر ملایا کے اوّلین برطانوی حکمرانوں میں سے کسی مارسڈن صاحب سے متعلق ہیں۔ اُن کی انتظامی فتوحات اور تدبیری کارنامے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کارنامے خود مارسڈن صاحب ہی نے قلمبند کروائے ہوں۔

گزشتہ اور رواں صدی میں ملائی ادب نے کچھ ترقّی تو ضرور کی ہے مگر رفتار کو تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا۔ تقریباً پوری ایک صدی کی مدّت میں پانچ یا چھ معیاری ادیب پیدا ہوئے جن میں سے زین العابدین بن احمد، سیّد الشیخ اور کلانتان کے احمد اسماعیل زیادہ ممتاز و قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے سیّد الشیخ، عراقِ عرب، مصر و شام وغیرہ کی اسلامی تاریخ کے پس منظروں میں ناول لکھنے کے لئے مشہور ہیں گویا وہ ملایا کے "عبد الحلیم شرر" ہیں۔ احمد اسماعیل نے شیکسپیئر، ایڈگر ویلس، اسٹیفنسن اور چند دوسرے یورپی مصنفین کی بعض مشہور تصانیف کو اپنی زبان میں ڈھال کر اپنے ادب کو کچھ نئے افق دیئے ہیں۔ یہ ہے ملائی ادب کی تمام کائنات۔

اثرات کے اعتبار سے ملائی ادب کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ ہندوستانی دور

۲۔ اسلامی دور

۳۔ برطانوی دور

جاوا اور ملایا تقریباً ایک ہزار برس تک براہِ راست یکے بعد دیگرے ہندو اور بدھ تہذیب و تسلط کے زیرِ اثر رہ چکے ہیں۔ اِس زمانہ میں ممکن ہے بہت کچھ لکھا گیا ہو لیکن اب کتابوں میں رامائن و مہابھارت کی کہانیوں یا پھر

قدیم مندروں کی دیواروں پر کندہ پراچین ہندی تہذیب کے بعض نقوش کے سوا اس دَور کا کوئی قابلِ لحاظ سرمایہ محفوظ نہیں رہ گیا۔ البتہ زبان میں سنسکرت الفاظ کی آمیزش جاوی اور ملائی لٹریچر میں قدیم ہندی فلسفہ کی جھلک اور خود ان دونوں ملکوں کے پُورے کلچر میں قدیم ہندوستانی تہذیب کی جو روح اب تک رچی بسی نظر آتی ہے، یقیناً اس زمانہ کی یادگار ہے۔ یہاں ضمناً یہ بات عرض کر دوں کہ جاوا، سماٹرا، ملایا اور بورنیو سیاست، تاریخ اور جغرافیے کے تھوڑے بہت اختلافات کے ساتھ دراصل ایک ہی لسانی و تہذیبی وحدت کے مختلف نام ہیں۔

اسلامی دَور، ملایا میں بھی علم و فضل کی ہر جہتی ترقی کا دَور تھا۔ مصری، عربی، اور فارسی زبانوں سے اکثر تراجم، جن کا سرسری تذکرہ اُوپر آچکا ہے، اسی دَور میں کیے گئے۔

برطانوی دَور میں ادب میں بھی سیاست نے ترقی کی ہے۔ حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ چند تراجم کے سوا، جن میں سے بیشتر برطانوی اہلِ تدبیر و شمشیر کے سوانحِ حیات پر مشتمل ہیں، پچھلی نصف صدی سے ملائی ادب میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں ہوا۔ انگریزوں کی وجہ سے البتہ انگریزی اور پھر انہیں کے تعلق سے ہندوستان کے بڑھتے ہوئے ربط و ضبط کے باعث اُردو کے سینکڑوں الفاظ مقامی بولی میں ضرور گھل مل گئے ہیں لیکن بحیثیتِ مجموعی ملائی ادب پر مغربی ادب کے تأثرات جن سے آج ایک دنیا متأثر ہے، بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ مقامی اہلِ قلم کی قدامت پسندی و روایت پرستی ہو۔ یا انگریزی ادب سے ناواقفیت۔

مذہبی معتقدات، اسلام کے فکری و عملی نظام، الٰہیات اور تصوّف و روحانیت سے متعلق فکری و نظری بحثوں کی صورت میں اہلِ ملایا نے بہت کچھ لکھا ہے (وہی

اسلامی دَور ہیں) مگر یہ قابل قدر ذخیرہ زیرِ نظر موضوع کی ضرورت و دلچسپی سے خارج ہے۔ رائج الوقت درسی کتابوں کی ورق گردانی کی تو ان میں بھی وہی طوطے مینا کے قصے بھرے پڑے تھے یا پھر کلائیو اور ڈلہوزی کے بجائے کیپٹن فرانسس لائٹ اور سر سٹامفورڈ ریفلز کے کارناموں نے صفحات گھیر رکھے تھے۔

شعری ادب کی حالت اس سے بھی زیادہ پتلی تھی۔ پنجابی سی حرفیوں کی طرح چھپے ہوئے چند پرانے کتابچوں کے سوا مستند شاعری کا کوئی قابلِ ذکر مجموعہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ کوئی تھا بھی تو ہماری بدقسمتی سے جاپانیوں کے زمانۂ تسلّط میں تلف ہو چکا تھا۔ بعض مقامی اہلِ علم، مدرسوں، صحافیوں، دانشوروں اور ثقافتی رہنماؤں سے رجوع کیا تو وہ پرانے زمانے کے چند صوفی شعرا کے نام، جن میں سماٹرا کا حمزہ سب سے نمایاں ہے، تو ضرور گنواتے تھے اور ان کے اشعار بھی سناتے تھے۔ لیکن کتابی صورت میں کسی بڑے شاعر کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا۔

انگریز مستشرقین میں سے ڈاکٹر ون سٹیڈ نے جو مشرق بعید پہ حرفِ آخر تسلیم کئے جاتے ہیں کچھ معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کی تحقیقات کا نچوڑ یہ ہے کہ عربی عروض اور ہئیت کی پابندی کے ساتھ ملائی شاعری کا باقاعدہ آغاز پندرھویں صدی میں ہوا۔ جو اتفاقاً یہاں بھی مسلمانوں کے سیاسی زوال کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کی طرح ملایا میں بھی ابتداً مثنوی کا زور بندھا رہا۔ مثنوی "اورنگ سلونگ" جس میں سمندری طوفان کے استعارے سے سلاطینِ ملاکا کے عروج و زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس دور کی کامیاب ترین نظم سمجھی جاتی ہے۔

کافی مدّت کے بعد مختصر نظموں کا رواج ہوا جن کی ابتدا دراصل وہی سلاطینِ ملاکا

کے زوال پر ایک قسم کے نوحوں سے ہوئی۔ غزل یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ملائی ادب میں نظر نہیں آتی۔ اس ضمن میں یہ بات دلچسپی کے ساتھ سنی جائے گی۔ کہ ڈاکٹر ون سٹیڈ کو اپنی تحقیق و جستجو کے دوران میں پرانی کتب تاریخ و سیر سے زیادہ مدد قبروں کے کتبوں یا قدیم عمارتوں پر کندہ تحریروں سے ملی تھی۔

ملائی ادب میں تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں پیراک (ریاست) کے ایک انگریز پروفیسر صاحب کا بڑا غلغلہ تھا۔ سوچا، شاید اُن سے کچھ مزید "روشنی" حاصل ہو جائے، لیکن اڑھائی تین سو میل کا سفر طے کرنے کے بعد جب شرفِ نیاز حاصل ہُوا تو پتہ چلا کہ پروفیسر صاحب کا اوڑھنا بچھونا محض "شجرۂ ملایو" تھا۔ اسی پر ایک مقالہ لکھ کر انہوں نے یورپ کی ایک جامعہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ بعد میں اسی کے تانے بانے کو بڑھا پھیلا کر یورپ کے بعض جرائد میں ملائی ادب اور کلچر کے بارے میں کچھ ایسے بھول بھلیاں قسم کے مضامین لکھے کہ سارے یوروپ میں اس ریسرچ کی دھوم مچ گئی اور یورپ میں دھوم مچ جائے تو ساری دنیا میں دھوم مچ جاتی ہے۔ بہرحال پروفیسر موصوف ہماری کوئی مدد نہ کر سکے۔ البتہ اتفاق دیکھئے کہ دو اداروں کے ایک چینی ڈاکٹر کے ذاتی کتب خانہ سے ملائی "پنتونوں" کے دو چھوٹے چھوٹے مجموعے مل گئے جو ملایا سول سروس کے دو انگریز افسروں مسٹر ہملٹن اور ولکنسن نے انگریزی میں منظوم ترجمے اور حواشی کے ساتھ کسی زمانے میں شائع کئے تھے۔ دونوں میں مشترکہ گیتوں کی کافی تعداد آگئی تھی لیکن ترجموں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

بہرحال کوشش قابلِ قدر تھی اور میں نے ان تراجم سے بہت فائدہ اُٹھایا جس کے لئے میں اپنے اجنبی دوست ڈاکٹر لیونگ جی کا بیحد شکر گزار ہوں کہ اگر اُن کی مہربانی سے "پنتونوں" کا یہ اچھا خاصہ مجتمع ذخیرہ میرے ہاتھ نہ لگ جاتا تو ایک ایک پنتون کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اُسے پکڑنے کے لئے جس فرصت، جس ہمت اور جن وسائل کی ضرورت تھی، وہ میرے پاس کہاں تھے؟

آئیے اب "پنتونوں" کی طرف چلیں!

پنتون، ملایا، جاوا کی شاعری میں اظہارِ خیال کی مقبول ترین صنف کا نام ہے آپ اسے ایک قطعہ یا رباعی سمجھیں جس کا پہلا مصرع چوتھے کا اور دوسرا اور تیسرا مصرع آپس میں ہم قافیہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی کڑی بندھی ٹکی پابندی نہیں بعض اوقات قافیہ سرے سے لایا ہی نہیں جاتا۔ محض صوتی ہم آہنگی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ "پنتونوں" کا بڑا ذخیرہ دراصل لوک گیتوں" پر مشتمل ہے جن کا نہ کوئی مصنّف کسی کو معلوم ہے اور جو علمی حیثیّت سے مرتّب ہیں نہ محفوظ، لہٰذا اس معاملے میں ایسی فنی و تکنیکی بحث کا اٹھانا ہی بیکار ہے۔ ایک پنتون کی اصلی صورت و ہیئت کیا تھی۔ پھر اَن پڑھ عوام کے ہاتھوں اس کی کیسی کچھ درگت بنتی رہی؟ کون بتا سکتا ہے؟ تاہم پنتون کی عام مروّجہ ہیئت وہی ہے جس کی طرف میں ابھی اشارہ کر چکا ہوں۔

یہ تو تھی ہیئت۔ جہاں تک معنی کا تعلق ہے، پنتون مختلف چیزوں مثلاً گیت عشقیہ قطعات، منظوم ضرب الامثال، تاریخی واقعات حتیٰ کہ بجھارتوں اور پہیلیوں تک کا ایک عجیب ملغوبہ معلوم ہوتا ہے، پہلے ایک (یا حسبِ ضرورت) دو مصرعوں

میں محض فضا قائم کی جاتی ہے۔ تفہیمی اشارات دیے جاتے ہیں، اعلان کی طرح کوئی بیان سامنے رکھا جاتا ہے، ماحول کے تأثر اور موسیقی کے رس کو اُبھارا جاتا ہے۔ اور پھر آخری دو تین مصرعوں میں اصل مطلب بیان کیا جاتا ہے، خیال کو نقطۂ عروج پہ لایا جاتا ہے۔ بعض اوقات پہلے اور باقی مصرعوں کے درمیان بظاہر کوئی معنوی ربط موجود ہی نہیں ہوتا۔ مسٹر ہملٹن کا خیال ہے ـــــ اور مقامی اہل الرائے کی اکثریت اس خیال کی تائید کرتی ہے ـــــ کہ ایک نازک و لطیف معنوی ربط ضرور موجود ہوتا ہے جو دراصل روایات اور پس منظر کی غرابت کی وجہ سے اجنبی ذہن کی گرفت میں نہیں آتا۔ ممکن ہے یہ بات ٹھیک ہو۔ لیکن میں اس توجیہہ سے کچھ زیادہ مطمئن نہ ہو سکا۔ میں نے کئی ایسے لکھے پڑھے مقامی دوستوں سے جو انگریزی میں بات سلجھا کر بیان کرنے کی اتم صلاحیت رکھتے تھے، اس "ربطِ خفی" کو سمجھنے کی کوشش کی اور ازراہِ مسافر نوازی انہوں نے میرے اطمینان کی خاطر بڑی سردردی سے کام بھی لیا مگر رشتۂ خیال پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔

ہو سکتا ہے یہاں بھی زبان و رسوم کی غرابت کا مسئلہ لاشعور میں کھڑا ہو۔ بہرحال میں نے اس مسئلے کو یوں حل کیا ہے کہ ایسے "ٹپنتونوں" کو، جن کے سر اور دھڑ میں کوئی ربطِ معنوی مجھے نظر نہیں آسکا، اپنے انتخاب میں شامل نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا ترجمہ میرے لئے آسان تھا۔ مجھے قلق کے ساتھ اعتراف ہے کہ اپنی کوتاہ فہمی و نارسی کی وجہ سے میں بعض نہایت پیارے اور لذیذ ٹپنتونوں کو اس مجموعہ میں جگہ نہ دے سکا۔

پنتوُن کی یہ "بے ربطی" کوئی عیب بھی نہیں ہے۔ یہ دراصل اس کی مختلف تکنیکی صُورتوں میں سے ایک صورت ہے بلکہ میرے نزدیک لوک گیتوں میں (بشرطیکہ سررشتۂ خیال ہاتھ آجائے) اس قسم کی استفہامیہ پردہ داری، جو سماجی رمزیت میں گندھی ہوئی ہو، گیت کے حُسنِ تاثر اور بین السطور میں چھپی ہوئی ایک خاص قسم کی لذت کو اور بھی رسیلا بنا دیتی ہے۔

—— اور "پنتوُن" ملایا، جاوا کے لوک گیت ہی تو ہیں جو ان سکوں درآغوش زمرد زاروں میں زندگی کی طرح پھیلے ہوئے ہیں —— کس نے لکھے، کب لکھے گئے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ جذبات و محسوسات کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے کہ نہ جانے کتنی صدیوں سے سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو ورثتاً ملتا چلا آرہا ہے۔ پنتونوں کو اِس خطّے میں دراصل وہی مرتبہ حاصل ہے جو ہمارے ہاں پنجاب میں "ماہیا" کو حاصل ہے۔ مگر یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ ادبی پہلو سے ان جزیروں کا خوبصورت ترین شعری ادب اسیٔ "شعرِ آوارہ" پر مشتمل ہے۔ ابھی عرض کیا تھا کہ "پنتوُن" وہاں زندگی کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ جملہ میں نے کسی وِن سٹیڈ یا ہملٹن کی کسی کتاب میں سے نہیں لیا۔ یہ حقیقت میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ پنتوُن وہاں پھیلے ہوئے ہی نہیں اُن لوگوں کی زندگی پر چھائے ہوئے بھی ہیں۔ مردوں کو یاد ہیں، عورتوں کو یاد ہیں۔ وصال کی مجلسوں میں گائے جاتے ہیں، فراق کی تنہائیوں میں دُہرائے جاتے ہیں۔ "کمپُونگ" گاؤں کی مجبور کنواریوں کے لبوں سے پھوٹتے ہیں، دہقانوں اور مچھیروں کی آزاد تانوں میں گونجتے ہیں۔ امیروں کے بنگلے، غریبوں کے جھونپڑے اس کے رنگ اور رس سے یکساں لبریز ہیں۔ اور جب میں

یہ کہتا ہوں تو خدا کے لئے اسے رنگینیٔ داستان کا کوئی چٹخارہ نہ سمجھئے۔ میں اپنا ذاتی مشاہدہ، تجربہ بیان کر رہا ہوں۔ "پنتون" مجھے اپنے فوجی یونٹ میں برتن مانجنے والے لڑکے سلامتے سے بھی ملے اور جوہور کے وزیرِ اعظم واتو جعفر بن عون سے بھی۔ مغربی طرزِ تمدن کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ لینے کے بعد ہمارے یہاں کی کلچری زندگی میں جو ایک عظیم طبقاتی بُعد محسوس ہوتا ہے، وہاں قطعاً نظر نہیں آتا۔ وہاں کا واتو عون اگر دن کو پارلیمان میں انگریزی بولتا ہے یا شام کو انگریز ہائی کمشنر کی کاک ٹیل پارٹی میں شریک ہوتا ہے تو رات کو بڑے خلوص، شوق اور ایک جائز فخر کے ساتھ، اپنے گھر میں احباب کے ساتھ، بال بچوں کے ساتھ بیٹھ کر اُن میں گھُل مل کر، اُن کی لَے میں لَے ڈال کر، اپنے دیس کے یہ میٹھے اور رسیلے گیت بھی گاتا اور الاپتا ہے —— اور جب عالی شان عمارتوں اور پست و تاریک جھونپڑوں میں سے پنتون یعنی ایک بنیادی کلچر کی یہ دلنواز و دلنشیں تانیں جذبات کے یکساں خلوص کے ساتھ یکبارگی بلند ہو کر فضا میں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی کا دھارا ایک نقطے پہ آ کے رُک گیا ہو، جم گیا ہو —— ملایا میں زندگی کی قدیم و جدید قدروں کا ایک صحت مند و خوبصورت توازن جو رفتارِ حادثات کے اس زمانے میں بھی موجود ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ان لوگوں کو اپنی قدیم تہذیبی روایات اور کلچری سرمائے سے بے اندازہ عشق ہے۔

خالص ادبی حیثیت سے مجھے پنتون کی نسبت کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں ایک بات کی طرف اشارہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو مجھے بے حد حیرت انگیز معلوم ہوئی اور جس نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ لوگ گیت عموماً جذبات

کی شدت اور خلوص، اسلوب کے لوچ اور رس، تاثرات کی سچائی اور سادگی، مشاہدے کی مقامی عمومیت اور تجربے کی بے لاگ بیباکی کے باعث مقبول و مرغوب ہوتے ہیں لیکن ان کا ادبی پایہ کم از کم فن اور تکنیک کے اعتبار سے کچھ ایسا بلند نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ (میرے علم کے مطابق) ان تمام محاسن کے باوجود کسی ملک کے لوک گیت اُس ملک کے ادبِ عالیہ میں کبھی بار نہیں پا سکے ۔ خودرو پھولوں کے اِن دلنواز گلدستوں کو ہمیشہ ادبِ عالیہ کے نیچے ایک لکیر کھینچ کر سجایا جاتا ہے لیکن "پنتون" کی نسبت آپ یہ نہیں کہہ سکتے ۔ ان میں جذبے کی شدت، اظہار کا خلوص، الفاظ کا لوچ، تاثر کی سچائی، غرضیکہ ہر وہ شے موجود ہے جو ایک عوامی گیت میں ہونی چاہیے ۔ لیکن ان بنیادی اجزا کے ساتھ ساتھ پنتون ایک اعلیٰ ادبی پایہ کا فن پارہ بھی ہے ۔ خوبصورت، سُبک، رواں دواں ۔ ان خودرو پھولوں کی ترتیب میں ایک عجیب سلیقہ پنہاں نظر آتا ہے ۔ ان کے رخساروں پر صنّاع کے ہاتھ کی کوئی ہلکی سے خراش تو دکھائی نہیں دیتی لیکن اُس کے دل کا حسن اور کرب اُبل اُبل کر نمایاں نظر آتا ہے ۔ ان کی تکنیک میں ترقی و تکمیل کی شاید کوئی گنجائش ہو ان کے حسن و جمال میں یقیناً کوئی کمی نہیں، ایک سائے کی کمی نہیں پنتون کے متعلّق اگر مجھے صرف ایک جملہ لکھنے کی اجازت ہو تو میں کہوں گا ـــــــ "زندگی کی سچّی اور جمیل ترین تصویر" ۔

ـــــــ اور شعر کی تعریف میں کم از کم مَیں نہیں جانتا کہ اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے ۔ سچ یہ ہے کہ ملایا کی جنتِ ارضی کے آغوش میں ایسے ہی پُر بہار پھول کِھل سکتے تھے ۔

اب اپنے ترجمے کے متعلق دو چار ذاتی سی باتیں :-

ہملٹن اور ولکنسن کے مجموعوں سمیت دو ڈھائی سال کی مدت میں مَیں نے خاصے بہت سے پنتون جمع کر لیے تھے۔ ان میں سے اکثر مختلف مقامی احباب کے عطیے تھے۔ کچھ نغمے میں نے خود رقص گاہوں، ساحلی میلوں اور ملایا کے خوابگوں "کمپونگوں" میں جا کر سُنے اور چُنے لیکن ترجمے کے لئے صرف وہی پنتون منتخب کئے ہیں۔ جن کی "روح" کو مَیں اپنی دانست میں پا سکا ہوں۔ جن کو میں اتنی اچھی طرح نہیں سمجھ سکا (اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے) کہ صفائی و سچّائی کے ساتھ اردو میں منتقل کر سکتا، انہیں نظرانداز کر گیا ہوں۔

ترجمہ اور پھر شعر کا شعر میں ترجمہ! میرے لئے یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ اصل کی تمام خوبصورتیوں، لطافتوں اور نزاکتوں کو اسی دلکشی و بلاغت کے ساتھ ترجمے میں سمیٹ سکا ہوں۔ یہ بات کچھ آسان نہیں۔ بالخصوص نیلم و مرجان۔ اناس اور دھان کی جنّتوں میں سے پھوٹنے والے ان گیتوں کے حسن کو اُردو میں جوں کا توں ڈھال دینا میرے لئے ممکن نہ تھا البتہ دیانتداری کے ساتھ میری یہ آرزو اور کوشش ضرور رہی کہ شعر کی روح، خیال کی سالمیت، گیت کی لَے، اور جہاں تک میرے بس میں تھا، فضا کے مقامی تاثر اور اسلوب کی بے داغ شگفتگی پر، جو اصل کا خاصہ ہیں، آنچ نہ آنے دوں "پنتون" کے جمالیاتی پہلو کو، جو میرے نزدیک اس کا سب سے بڑا حسن ہے، میں نے حتّی الوسع دبنے نہیں دیا۔ اور جہاں کہیں اس طرح مجبور ہو گیا ہوں کہ شعر کی باطنی بلاغت اور آرٹ کے خارجی حسن میں سے صرف ایک ہی سانچے کو نمایاں کر سکتا تھا، میں نے اسلوب اور فضا کے حسن کو نمایاں کرنا ہی مناسب سمجھا ہے۔

کہ میرے نزدیک پشتون کا مابہ الامتیاز اُس کی یہی خوبی ہے۔ کہیں کہیں اسلوب کے اقتضا، اجنبیت کے الجھاؤ، میرے عجزِ طبع یا ضرورتِ شعری نے اگر میرا "قافیہ تنگ" کر دیا ہو تو مجھے معذور سمجھا جائے۔ میں صرف اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ میں نے اپنی توفیق و صلاحیت کے مطابق پورے زور کی لڑائی کے بعد ہتھیار ڈالے ہوں گے۔

بہت ممکن ہے کہ بعض مقامات مضمون و مفہوم کے لحاظ سے واضح معلوم نہ ہوں۔ یہ الجھاؤ اصل پشتون کے اُس ابہام کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے جس کی طرف کہیں اوپر اشارہ کر چکا ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے اطمینان کے باوجود میں پشتون کی "روح" تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کے علاوہ ایک بات اور کہ جو پشتون بھدّا، پھیکا یا پھسپھسا معلوم ہو اُس کی تمامتر ذمہ داری میرے بھونڈے ترجمے پر ہے کہ پشتون میں اور کچھ ہو یا نہ ہو وہ ایک خوبصورت، پُربہار اور پُرخمار چیز یقیناً ہے۔ اور ہر چند میں نے (عموماً) لفظی ترجمہ کرنے کے بجائے جذبے اور خیال اور مجموعی تاثر کو اپنی زبان میں ڈھالنے کی سعی کی ہے، تاہم مجھے اِس بات کا اعتراف ہے کہ جمالیاتی محسوسات و وجدان کے وہ رنگا رنگ سائے جو پشتون کے بطون میں سے جھانکتے اور جسم پر لرزتے، سمٹتے رہتے ہیں، پوری طرح میری گرفت میں نہیں آسکے۔

اگرچہ سب ملائی پشتون کسی ایک وزن یا بحر میں نہیں ہیں لیکن اتنی بہت سی بحور میں بھی نہیں ہیں کہ جن کا سہارا مجھے لینا پڑا ہے۔ اِبتدا میں میری یہ کوشش بھی رہی کہ کسی ایک زمین پر ڈٹ جاؤں مگر نزاکتِ معنی اور لطافتِ شعری کے ہجوم میں سے راہ نکالنا دشوار ہو گیا۔ کہیں الفاظ کم اور معنی زیادہ، کہیں معنی کم اور الفاظ زیادہ۔ پھر استعاروں، کنایوں اور تشبیہوں کی قطار در قطار یورش سے ہر ناکہ بند، ناچار

ہر "پنتون" کے مزاج (حفیظ جالندھری سچ کہا کرتے ہیں کہ ہر شعر کا ایک اپنا مزاج ہوتا ہے) کی مناسبت سے جس بحر میں بھی سینگ سمائے ہیں نے کود جانے سے دریغ نہیں کیا اگر ایک ہی وزن قائم رہ سکتا تو واقعی ایک بات ہوتی مگر یہ بات مجھ سے نہ ہو سکی۔ زندگی میں کتنی باتیں ہیں جو آدمی کرنا چاہتا ہے لیکن نہیں کر سکتا ؟

مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

پنتون کی "روح" تک پہنچنے کے لیے جن جن راستوں اور گھاٹیوں سے ہو کر گزرنا پڑا، تھوڑی سی رُوداد یہ بھی سُن لیجیے :۔

پہلے تو یہ کام سہل معلوم ہوا۔ اِرادہ کیا لاڈ ڈاکٹر لیونگ جی کے دیئے ہوئے انگریزی ترجموں میں سے جو کچھ جس طرح بھی سمجھ میں آتا ہے وہی سہی۔ چنانچہ

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

مگر جب ان تراجم کو زیادہ غور سے دیکھا اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آیا، تو رُک گیا۔ سوچا۔ اگر چند اشارات کی مدد سے "طبعزاد" اشعار ہی کہنے ٹھہرے ہیں تو پنتون کا نام لے کر اس لطیف شاعری کو بدنام کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟ دل نے ملامت کرتے ہوئے کہا — "مردِ من — ہمت کر"

ہمتِ مرداں مددِ خدا

چنانچہ جناب دل کے ارشاد پر ہم نے کمرِ ہمت کس لی۔ لیکن جب تک ملائی زبان نہ آئے محض کمر کس لینے سے کیا ہوتا تھا۔ تھوڑی بہت شُدبُد اس میں بھی خیر کچھ مدت میں پیدا کر لی مگر بات وہیں کی وہیں رہی۔ ہم اب بازار سے مرغی، انڈا، آلو تو کامیابی سے خرید سکتے تھے مگر یہاں تو مقصود زبان کی نزاکتوں اور رانوٹوں

تک رسائی کا تھا جس کے لیے "اساتذہ" نے صرف ایک ہی "نسخۂ شافی" تجویز کیا ہے کہ اس ملک کی عورت سے شادی کر لو۔ لیکن محض ترجمے کی آسانی کیلئے شادی کر لینا ایک مہنگا سودا تھا۔ بہر حال، اس مرحلے پہ میں "ہمتِ مرداں" کی حماقت پر لعنت بھیج کر کمرِ ہمت کھولنے ہی والا تھا کہ اچانک "مددِ خداوندی" آ پہنچی — بعض اوقات امید کی کرن مایوسی کی آخری سرحد ہی پہ جا کر پھوٹتی ہے۔

ہُوا یہ کہ ہمارے عزیز دوست اور رفیقِ کار کیپٹن مسعود احمد نے ترجمے کی کسی ضرورت کے بغیر ہی وہاں کے ایک شائستہ ذی عزّت گھرانے میں شادی کر لی۔

یہ تذکرہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ مسعود کی شادی کا واقعہ ایک سنگِ میل کی حیثیّت رکھتا ہے۔ اب میں اپنی سوجھ بوجھ لڑانے کے بعد مسعود اور مسعود سے زیادہ زین بھابھی سے، جو بڑی رواں انگریزی بولتی ہیں، پنتونوں کی "روح" سمجھنے لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر زینؔ بھابھی بے دریغ خندہ پیشانی اور بے پایاں خوش خلقی سے کام لے کر گھنٹوں اور پہروں بیٹھی افہام و تفہیم کی اس مہم میں میری مدد نہ کرتیں تو میری مشکل خوفناک طور پہ دشوار ہو جاتی۔ مسعود تو خیر دوست ہُوا۔ لیکن زین بھابھی کا میں صمیمِ قلب کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مقامی مہربانوں میں سے بیرسٹر اِنچے سعدون بن زبیر اور سنگاپور کے کثیر الاشاعت روزنامہ اخبار "اتوسن ملایو" کے چیف ایڈیٹر توان یوسف بن اسحاق کو بھی میں اکثر زحمت دیتا رہا۔ اِنچے سعدون جو بیرسٹر سے زیادہ لیڈر تھے، لیڈری کے ہزار دل

جھمیلوں کے درمیان میرے لئے وقت نکال لیتے اور توان یوسف ایک روزانہ اخبار کی حواس باختہ مصروفیت کے باوجود میرے لئے جو فرصت اور فرصت سے زیادہ اطمینان فراہم کر لیتے تھے، سچ یہ ہے کہ میں اس وقت اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ فراہم کرنے سے بھی معذور ہوں۔ اِنچے سعدون تو خیر پھر بھی لیڈر تھے اور لیڈر لوگ کبھی کبھی خدمتِ خلق کی رو میں آ ہی جاتے ہیں۔ لیکن توان یوسف کی شرافت و مروّت، وضع داری اور مسافر نوازی پر تو بعض اوقات مجھے رحم آنے لگتا تھا اور دل میں ایک قسم کی ندامت کا احساس ہوتا تھا کہ میری وجہ سے یہ شخص کسی عذاب میں گھر گیا ہے۔ یہ دونوں نامور مسلمان انگریزی اور ملائی دونوں زبانوں کے جلیل القدر ادیب ہیں۔ بھائی مسعود اور بھابھی زینؔ سے جو گتھیاں بچ رہتی تھیں۔ میں وہ لئے لئے ان کے پاس پہنچتا اور یہ دونوں بڑی شفقت اور محنت کے ساتھ میری رہنمائی کرتے۔ اِن کرمفرماؤں کے خلوص و محبّت، وسیع حوصلگی اور عالی ظرفی کے جو غیر فانی نقوش میں اپنے ساتھ لایا ہوں وہ ان کے خوبصورت وطن کے سدا بہار پنتونوں کی طرح میرے دل میں زندہ و تابندہ رہیں گے۔

اب صرف "مرشد" کا شکریہ میرے ذمّے رہ گیا ہے۔ مگر ڈرتا ہوں کہ شکر و سپاس کے معروف رسمی الفاظ (اور ان سے باہر نکل کر کہاں جاؤں؟) میرے جذباتِ تشکّر سے انصاف بھی کر سکیں گے؟ اس ضمن میں میرا اور مُرشد کا معاملہ دراصل شکر و سپاس کی سطحوں سے اُڑ کر "من تو شدم تو من شدی" کی بلندیوں پہ پہنچا ہُوا ہے۔ کبھی تو یوں سوچتا ہوں کہ اس سارے قصّے میں خود مرشد کو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ نہ وہ پنتون پر اس بُری طرح سے فریفتہ ہوتے نہ مجھے ترجمے کا خیال پیدا ہوتا پنتونوں

پر انہیں ایک حالتِ وجد و جذب میں جھومتے، رقص کرتے دیکھ کر خواہ مخواہ دل میں تحریک پیدا ہوتی تھی کہ جس شاعری نے ہمارے مُلک کے اتنے بڑے انشاپرداز، شاعر، صحافی اور نقاد کو یوں "لہولہان" کر رکھا ہے، یقیناً اُس میں کوئی بات ہو گی۔ یہی خیال ترجمے کی اوّلین تحریک کا باعث ہُوا۔ لہٰذا ضمناً یہاں قارئین سے گزارش ہے کہ اگر انہیں "پنتوُن" میں "عظیم و دلآویز شاعری" کی کوئی علامت نظر نہ آئے تو اس کا جواب مولانا چراغ حسن حسرت سے طلب کیا جائے۔

ترجمے پر اُکسا کر مُرشد نے مجھے تو جس مصیبت میں ڈالا سو ڈالا مجھے اتنی تسکین ضرور ہے کہ انہوں نے اپنے لئے بھی ایک مستقل دردِ سر سہیڑ لیا۔ دن رات کا ساتھ، لہٰذا دن رات کا مشورہ۔ میں زین بھابھی، اِنچے سعدون اور نوال یوسف سے پنتوُن کی "روح" سمجھ کر آتا تو مُرشد ــــ تنکو ابوبکر اور ربیّد علی الشتّاف ایسے فضلا سے صرف و نحو کی باریکیوں پر تبادلہ خیال کرنے نکلتے۔ واپس آتے تو جو ترجمہ ہو چکا ہوتا تھا، موٹی سُرخ پنسل لے کر اس سارے پر لکیر پھیر دیتے۔ اب بحث کا دروازہ نئے سرے سے کھلتا۔ زبان و بیان کا محکمہ خاص طور پر ان کے سپُرد تھا۔ چنانچہ مرشد ایک ایک محاورے کو دس دس زاویوں سے ٹھونک بجا کر دیکھتے، زبان کی گھلاوٹوں میں گھلتے اور اسلوب کی صحت و سلامتی کے نسخے تجویز کرتے۔

اِن کے مشورے کا انداز بجائے خود ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ شروع شروع میں تو یہاں وہاں ایک آدھ لفظ بڑھا گھٹا دیتے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب پنتوُن کی "روح" تک پہنچنے کا سوال زیادہ شدّت و ذمہ داری اختیار کرتا چلا گیا، یہ معمول ہو گیا کہ ترجمہ سن کر پہلے شعر کی لطافت اور گریمر کے نکات پر ایک تقریر فرماتے اور پھر وہی

دفتر کی سُرخ موٹی پنسل اٹھاکر ترجمے کے ساتھ اصل پنتوں پر بھی لکیر کھینچ دیتے۔
"غلط۔ واہیات۔ بکواس"

"ارے میاں یہ "حیراں حیراں" تو یہاں کوئی حادثہ معلوم ہوتا ہے۔"

"اور یہ "منفعل" — خضر حیات خاں کے ناک کی طرح کرخت ہو گیا ہے۔"

"تو کیا ہونا چاہیے، مُرشد۔" میں دست بستہ دریافت کرتا۔

"ہونا کیا چاہیے۔" وہ پہلا سگریٹ جس مرحلے پر بھی ہوتا پھینک کر دوسرا روشن کرتے ہوئے فرماتے — ہزاروں الفاظ ہو سکتے ہیں۔ وہ حکیم مومن خاں مومن نے ایک ایسے ہی موقعے پر...... مگر نہیں...... تم خود سوچو...... اور غور کرو ...... لتر لتر باتیں اتنی کرتے ہو تو ڈھنگ کا ایک لفظ کیوں نہیں نکال سکتے... پنتوں کی رُوح میں ڈوب کر کوئی لفظ لاؤ — اپنے اندر کو ذرا باہر نکالو۔"

ہمارے ساتھیوں میں "اکیک" (میجر احمد علی خاں جو آج کل برطانیہ میں پاکستان کے کمرشل اٹاشی ہیں) بڑے پکے رجمنٹل قسم کے فوجی افسر تھے۔ اس بحث کے دوران میں جب کبھی وہ ہماری طرف آنکلتے تو پائپ کو زور سے دانتوں میں دباتے ہوئے اکثر کہا کرتے ؛۔

"ویل۔ مولانا صاحب پریڈ ہو رہا ہے۔ جعفری کو کاشن دیا جارہا ہے۔"

قصہ کوتاہ، میں دوسری مرتبہ پنتوں میں غوطہ لگاتا۔ لیکن اس غوطے میں بھی جو موتی ہاتھ لگتے مُرشد کے ہاتھوں اُن کا حشر کچھ بہتر نہ ہوتا۔ اب اگر "روح" ہاتھ آگئی تھی تو محاورہ ہاتھ سے نکل گیا تھا اور محاورے کی توہین وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں اچھے خاصے، شائستہ اور منجھے ہوئے احمد علی خان

سے محض اس لئے چڑ تھی کہ وہ محاورے غلط بولتے تھے۔ مرشد محاورے پر گویا جان دیتے تھے اور یہاں ترجمے کی افراتفری میں محاورے ہی کی چول ٹھیک نہیں بیٹھتی تھی۔

کوئی محاورہ غلط بندھ جاتا تو مرشد غصے میں لال بھبھوکا ہو کر کہتے:۔

"میں پوچھتا ہوں، پنتوں ایسی لطیف شے پر ہاتھ ڈالنے کا تمہیں کس مسخرے نے مشورہ دیا تھا"

"آپ ہی نے تو فرمایا تھا مرشد" میں بڑی عاجزی سے جواب دیتا۔ اس پر مونچھوں میں سے مسکراتے ہوئے کہتے:۔

"ہاں، وہ میں نے یونہی کہدیا تھا۔ لیکن خیر ترجمہ بھی گو تم خاصہ کر رہے ہو مگر میرے بھائی محاورہ بھی ایک چیز ہوتی ہے"

بعض اوقات محض کسی محاورے کی خاطر سچ مچ لڑ ہی پڑتے۔ طنز و ظرافت کا یہ بادشاہ بھری محفل میں فقرہ بازی پر اُتر آتا۔ مثلاً سب لوگ کھانے کے میز پر بیٹھے ہیں کہ حسن عسکری (ابن سعید) کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے۔ "لو بھئی جعفری صاحب (اب میں صاحب ہو جاتا تھا) پنتونوں کا ترجمہ کرنے چلے ہیں منگلی ڈرائیور کو کلام سنا سنا کر انہیں واقعی اپنی نسبت کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے"۔ اور ادھر میرا جی چاہتا کہ اُبلے ہوئے آلو پھینک کر پلیٹ کو اپنے آنسوؤں سے بھر دوں۔ لیکن بعد میں پھر اسی شام گھنٹوں بیٹھے پنتونوں میں سے گر پڑے اور محاورے کے کیڑے چن چن کر نکالتے رہتے۔

محاورہ تو خیر مرشد کے خوف سے میں نے کم ہی کہیں آنے دیا ہے۔ لیکن

اس ترجمے میں اگر آپ کو گریمر کی کوئی غلطی کھٹکے۔ کوئی "شترگربہ" کہیں پکڑا جائے یا کوئی الف بلا وجہ گرا پڑا ملے تو سمجھ جائیے کہ تھک ہار کر جب میں نے اس شعر کو صاف مسوّدے پر لکھ لیا تھا، مرشد کی بحث کا دروازہ ابھی کھُلا تھا۔

اب آپ ہی بتائیں، ایسے ہمہ شفقت بزرگ، سراپا محبت دوست کا شکریہ کوئی کیا ادا کرے، کہاں تک ادا کرے اور کیوں ادا کرے؟

اس چھوٹے سے مجموعہ کو آج سے بہت پہلے چھپ جانا چاہیے تھا مسوّدہ جنوری ۱۹۴۶ء میں ملایا ہی میں تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن پاکستان آنے کے بعد کچھ ایسے حالات درپیش رہے کہ ۱۹۵۳ء تک میں اس کی اشاعت پر توجہ نہ دے سکا۔ بہرحال میں برادرم چودھری عبدالحمید صاحب ایم۔اے کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے مکتبہ کی طرف سے اس کی اشاعت کا ذمّہ اُٹھا لیا ہے اور امید ہے کہ اب یہ کتاب ایک دن چھپ ہی جائے گی۔

"چھپ ہی جائے گی"۔ اِس لئے کہ گزشتہ برس ایک مسوّدہ جس میں میرے دوست لفٹیننٹ کمانڈر حسن عسکری (ابنِ سعید) کا لکھا ہوا ایک جامع و مبسوط مقدمہ بھی شامل تھا، ایک بلند فن خوش نویس کی "توجہ" سے ضائع ہو چکا ہے۔ اب یہ دوسرا مسوّدہ مولانا چراغ حسن حسرت کے تعارف کے ساتھ مرتّب کیا ہے۔

سرورق کی تصویر میں آپ کو سرزمین ملایا کی بے اندازہ خوشں منظری کی ایک جھلک نظر آئے گی۔ یہ فوٹو میرے مکرّم دوست میجر غلام محمد کی عکاسی ہے

اِس عطیّہ کے لیئے میں اُن کا شکر گزار ہُوں[1]۔

راولپنڈی

ستمبر ۱۹۵۴ء

ضمیر جعفری

---

[1] مذکورہ تصویر پہلے مسودہ کے ساتھ ہی گم ہو گئی تھی۔ اس لیئے اب یہ کتاب ایک نئے گرد پوش کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔

—— آؤ دنیا میں پرانے اصولوں کے مطابق
زندگی بسر کریں۔ زندگی کی قدریں بکاؤ مال
نہیں جو منڈی میں خریدا یا بیچا جا سکے ——

(جاوا کی ایک قدیم ضرب المثل)

سارونگ باجُو

(مَلائی پنتُون)

سیر دنیا کی کی پتا پتا سب جا دیکھا تتلی کے پیچھے بھاگی پائیں پھول کلی نہ سمائیں وہ اس کی

جیسے دو سیلان گر کی حسین جھیل میں ہیں تیر پھول سے حسین انداز سونے ہوئے

جیسے خنک سے سفید ہیں پانی پیلے پھول کے دل سرخ ہے سرخ ہے ایک سے ہوئے

جیسے نقد انجان میں تارے سے چمکے ہوں ادا جیسے دل میں تیرے آئی انسان کی

○

بعدِ مدّت آج بنتِ غم تری یاد آگئی

جیسے لگ جائے اچانک بانس کے جنگل میں آگ

جیسے مایوسی میں لب پر دفعتاً آجائے راگ

یا کوئی مچھلی سنہری دھوپ میں لہرا گئی

○

زرد "دریانوں"[۱] کی صورت ایک دن تیرا شباب

دیکھ لینا اپنے رس کے زہر میں گھل جائے گا

دھڑکنوں کا راز رنگِ چشم سے کھل جائے گا

زندگی کو تلخ کر دے گا یہ "شیریں انقلاب"

---

[۱] مشرقِ بعید کا ایک مقبول و مرغوب پھل

○

طوفاں کا تلاطم یوں اُٹھّا، لہروں کے ترانے ڈوب گئے
آلام کے ریلے یوں آئے، اُمّید کا دامن چھوٹ گیا
دل پارا ہے، غم خارا ہے، اک چوٹ پڑی دل ٹوٹ گیا
افکار کی گہری جھیلوں میں خوشیوں کے ترانے ڈوب گئے

○

دُور یوں نہر گنگناتی ہے
جیسے ہندوستاں کا ساز کوئی
شب کے سینے کا جیسے راز کوئی
یا یتیمہ مجھے بُلاتی ہے

○

سیم گوں خوابوں میں، مَیں کھویا رہا کل رات کو

چاندنی میں ناریل کی چھاؤں کا وہ رقص و رَم

میرے شانوں پر وہ شاخوں کی طرح بانہوں کے خم

وادیٔ مہتاب میں سویا رہا کل رات کو

○

ریت کے ساحل پہ ہے تعمیرِ قصرِ آرزو

اِس طرح سے چھُوٹ جاتے ہیں مُدھر سپنوں کے تار

دفعتاً جیسے چمک کر ٹوٹ جاتے ہیں شرار

توڑ دیتی ہے سحر رانوں کا رنگیں تار و پوُ ——

○

بیباک کرنیں لہرا رہی ہیں
بادل نہیں ہے، سایا نہیں ہے
شہرِ ملا کا —— آیا نہیں ہے
شب رنگ زلفیں یاد آرہی ہیں

○

بادلوں میں یوں نظر آتی ہیں رنگیں دھاریاں
خواب میں پھیلے ہوئے ہوں جیسے سارونگوں[1] کے جال
جیسے ماضی کے تصوّر سے چمک اُٹھّیں خیال
جیسے وحشی ٹاپوؤں کی نیم عریاں ناریاں

---

[1] سارونگ - ایک شوخ و شنگ پہناوا

○

دُھندلی دُھندلی ہے آسماں کی جبیں

چاند اُبھرا نہیں سمندر سے

ماتمی پھول ہیں ستاروں کے

تو نہیں ہے تو آج کچھ بھی نہیں!

○

ناچتی گاتی ہوئی لہروں کے پار

ملگجے ٹاپُو کی دھندلی گود میں

کچھ فسردہ، زخم خوردہ پھُول ہیں

کیا اُدھر جاتی نہیں بادِ بہار؟

○

تُو ہے اِک بجلی خیالوں میں جو بَل کھاتی رہے

ایک رنگیں فاختہ "بابل" کے خلدآباد کی

ایک "میٹھی چاندنی" کھوئی ہوئی سی یاد کی

اِک چمکتی ویل جو لہروں پہ لہراتی رہے

○

میں تمہیں جانے نہ دوں گی کھول دو رختِ سفر!

یہ بھرے دریا ہمیں کچھ بھی کھِلا سکتے نہیں؟

کیا یہ ٹاپو چند دھانیں بھی اُگا سکتے نہیں؟

کیا محبت کو نہیں شامِ جدائی سے مفر؟

○

عید کی شامِ مسرّت ہے، طاقوں میں چراغ جلاؤں گی
آج کی شام وہ شام ہے بچھڑی روحیں ملنے آتی ہیں
پیار ہو جن سے اُن پیاروں کو ساتھ اپنے لے جاتی ہیں
شاید وہ بھی آجائیں، وہ آئے تو میں بھی جاؤں گی

○

تو مرا پھول ہے، تیری تتلی ہوں مَیں، اپنا رشتہ مسلّم بہر طور ہے
تجھ پہ شبنم کے موتی گراتی ہوں میں، تیرے رخسار پہ پھیل جاتی ہوں میں
تیرے پتوں کے نَم میں دھڑکتی ہوں مَیں، تیری شاخوں کا دل گدگداتی ہوں میں
تو مرے پاس ہے میں ترے پاس ہوں، میں کہیں اور ہوں تو کہیں اور ہے

○

پیاری سہیلی جا کر کہہ دے اُن سے ایک پہیلی تو
ہیروں کے سوداگر روپ سروپ کی بولی بول گئے
بکنے والی جنس کے اس منڈی میں اُونچے مول گئے
میرے آنسو لے جا، لے جا۔ اچھّی تو، البیلی تو

○

اِک آرزو میں نغمہ سرا ہو گئی ہوں مَیں
کِس کو نہیں ہے عشق ملاکا کے وہان سے
جس کے "کرِس"[1] کی دُھوم ہو ایسے جوان سے
کیا ہو گیا جو اُس پہ فدا ہو گئی ہوں مَیں

---
[1] کرس ۔ خنجر

○

اک سنہری آرزو یوں میرے دل میں کھو گئی

نیلگوں کھاڑی میں جیسے سیم پر مرغابیاں

(یہ چمکتی، جھلملاتی، ریشمیں بیتابیاں)

جیسے کوئی لہر، لہروں سے لپٹ کر سو گئی

○

شوخ چڑیاں اُڑ رہی ہیں دامنِ کہسار میں

اِن کھڑی اُونچائیوں سے کیا گزر جائیں گی یہ؟

یا چٹانوں ہی سے سر ٹکرا کے مر جائیں گی یہ؟

اژدہے منہ کھول کر بیٹھے ہیں گہرے غار میں

○

کل عہد کا ایفا کر نہ سکی، افسوس بہت مجبور رہی

"کلمپونگ"[1] کی اُلجھی بیلوں میں اک زہری ناگ نے کاٹ لیا

جو خون تھا تیرے بوسوں کا وہ خون رگوں سے چاٹ لیا

افسوس بہت مجبور رہی، افسوس کہ تجھ سے دُور رہی

○

اے مرے محبوب، اے مرغوب، دریائے مُوآر

تیرے دامن میں سمندر تک چلے جاتے تھے ہم

اپنے ڈونگے (لب بہ لب) مچھلی سے بھر لاتے تھے ہم

تیری لہریں خُوب، تو بھی خوب، دریائے موآر

---
[1] کلمپونگ۔ گاؤں

○

کلنتن کے بپھرے سمندر کی لہریں

ترے حُسن برہم کی تصویر گویا

ترے رس بھرے لب کی تفسیر گویا

سرادک کے چشمے، جگرتہ کی نہریں

○

پھر "قدح" کے گدلے دریا میں جو لہر ہے سو طوفانی ہے

"سمپان" جو زد پر آئے گا، ٹکرائے گا، بہہ جائے گا

اُس دل کا اک اُونچا ٹاپُو ان موجوں میں رہ جائے گا

جس دل کے پاس محبت ہے، جس دل کے پاس جوانی ہے

۱؎ سمپان - ماہی گیروں کی کشتی

○

شاہِ[۱] برما اپنے فیلوں کو بڑھا سکتا نہیں

ہاں قسم حسنا ترے پیارے لب و رخسار کی

تیری آنکھوں کے مقدس آنسوؤں کے ہار کی

ان حسیں دھانوں کی جانب کوئی آسکتا نہیں

○

میں اک ساحلِ پایاب سہی، اک جلوہ دکھلا بھی جاؤ!

ماہی گیروں کی دلدل میں بھی وہیلیں آ ہی جاتی ہیں

ٹوٹے پھوٹے "سمپانوں" پر بھی پر پھیلا ہی جاتی ہیں

میں دل پھیلا کر بیٹھی ہوں، اب آجاؤ، آ بھی جاؤ!

۱؎ ۱۷۵۰ء میں برما اور ملایا میں جنگ ہوئی تھی

○

یوں پہ تبسم ہے ماہ پاروں میں

زرد پھولوں میں اجنبی سا گلاب

اِک چھلکتا ہوا سا جامِ شراب

جس طرح چاند۔ (ماند تاروں میں)

○

پھولو! تم پھولوں میں پھولو! کاش یہ کانٹے چن نہ سکو

میری گل چینی کی تمنّا میں جو کانٹے چنتی ہیں

غم کے سنّاٹوں میں رہ رہ جن چیخوں کو سنتی ہیں

گیتو! تم گیتوں میں جھولو! کاش یہ چیخیں سن نہ سکو

○

ملاکا — مرے چاند تاروں کی بستی

جہاں یہ نظر اُس نظر سے ملی تھی

"شبِ دل" — طلوعِ سحر سے ملی تھی

ملاکا — مرے رازداروں کی بستی

○

دل کی خاموشیوں میں بھی آواز ہے، دل بھی کیا ساز ہے، راز ہے راز ہے

جیسے تامل[1] کنواری کی باہوں میں بجتی ہیں بندونگ[2] کے کانچ کی چوڑیاں

جیسے چُونے کے بے برگ ٹیلوں تلے آبِ شیریں کے چشمے رواں نغمہ خواں

چاپ قدموں کی بھی اپنے دالان میں جیسے دل کے دھڑکنے کا انداز ہے

کس کی آواز ہے؟

---

[1] جنوبی ہند کے تامل لوگ جو وہاں آباد ہیں

[2] بندونگ - انڈونیشیا کا ایک مشہور قصبہ

○

فلک مہرباں ہے، زمیں گلفشاں ہے

یہ رنگیں کنارے ہمارے لئے ہیں

یہ سارے نظارے ہمارے لئے ہیں

یتیمہ بڑی سنگدل تیری ماں ہے

○

تم زخموں میں ہنس لیتی ہو، تم کانٹوں پہ سو لیتی ہو

لیکن پیاری میں ہوں کہ مجھے ویرانی میں بھی بسنا ہے

"کمپونگ میں رہنا کھیل نہیں" دل روئے تو بھی ہنسنا ہے

تم دھانوں میں گا لیتی ہو، کھلیانوں میں رو لیتی ہو

○

دُنیا! چراغِ دل کے جلانے سے فائدہ؟

بتّی اگر ہوئی بھی تو اب تیل ہی کہاں؟

اب زندگی میں اُن سے مرا میل ہی کہاں؟

اے یادِ یار! لوٹ کے آنے سے فائدہ؟

○

کہتی ہیں یہ فراق کی تنہائیاں مجھے

عالم جو بن گیا ہے مٹایا نہ جائے گا

بے ہوش ہو کے ہوش میں آیا نہ جائے گا

اب راس آ چکیں مری رسوائیاں مجھے

○

اے سمندر! اے زمیں! اے زندگی! اے آسماں!

بجھ گئے ہیں وقت کے جھونکوں سے یوں دل کے چراغ

جس طرح مغرب کی پت جھڑ میں اُجڑ جاتے ہیں باغ

جیسے طوفانوں میں اُڑ جاتی ہیں سُوکھی پتّیاں،

○

"کُمپونگ" کی دوشیزائیں وہ لچکیلی نرم کمانیں ہیں

اِک بار جو ہاتھ سے چھُوٹ گئیں سو ہاتھ ملو بس چھوٹ گئیں

یہ کومل شاخیں اِک جھونکے کی گود میں جھُوم کے ٹوٹ گئیں

کیا چاندی چاندی مکھڑے ہیں کیا نازک نازک جانیں ہیں

○

وہ دل کی اُجلی چاندنی ہے، وہ روح کی بادِ بہاری ہے

تُم میرے دل میں جھانک کے دیکھو اُس کی منوہر صورت کو

تم میری آنکھوں سے دیکھو اس رس اور چھب کی مورت کو

اب دیکھو کتنی سندر ہے، اب دیکھو کتنی پیاری ہے

○

مری زندگی دھڑکنیں اور آہیں

جُھکا ہے کبھی آسمانِ محبّت؟

رُکا ہے کبھی کاروانِ محبّت؟

بڑی پُرکشش ہیں جوانی کی راہیں

○

اِن پرانی دلدلوں کو اپنی راہوں سے نہ دیکھ!

اِن میں طوفانوں کی دھڑکن، اِن میں دھانوں کی اُمنگ

اِن میں دَم ہے، اِن میں نَم ہے، ان میں رَم ہے، ان میں رنگ

دیکھ! ساحل کے پرندوں کی نگاہوں سے نہ دیکھ!

○

شہریاری ہی دلیلِ حسن و زیبائی نہیں

ساکیوں[1] کے جھونپڑوں پر بھی جب آتا ہے شباب

گھُپ اندھیروں میں بھی ڈھل جاتے ہیں کتنے آفتاب

حسن تاج و تخت کی جاگیر آبائی نہیں

[1] ساکی۔ مشرقِ بعید کے گونڈ، بھیل اور دراوڑ

○

کتنی دیواریں کھڑی ہیں میرے تیرے درمیاں

ناریل کی باڑ سے تو چھن ہی آتا تھا جمال

لیکن اب یہ جال؟ یہ ننگ و شرافت کے خیال؟

پاسِ طرزِ رفتگاں، احساسِ وضعِ خانداں

○

تیری یادوں کی شرابوں میں مگن، کھویا ہوا

ساحلوں پر اب بہار آئے کہ طوفانوں پہ رنگ

کھا چکا ہے میرے ارمانوں کو ارمانوں کا زنگ

میں ہوں اک کچھوا خود اپنے خول میں سویا ہوا

○

بے چین ہے دل، روح کو آرام نہیں ہے

چھلکا ہوا ہے دل میں مرے جام کسی کا

ہے روح کا آرام فقط نام کسی کا

اور کام جو پوچھو تو کوئی کام نہیں ہے

○

دل آج نشاط انگیز بھی ہے، اندیشوں سے لبریز بھی ہے

ساحل پہ کھڑی سوچوں میں پڑی، سپنوں کے ذخیرے دیکھتی ہوں

پُرہول بیاباں دیکھتی ہوں، پُرخواب جزیرے دیکھتی ہوں

"ہمپان" گجھور سے بوجھل بھی، لہروں کی روانی تیز بھی ہے

○

پلکوں پہ جو آنسو رہتا ہے تم سے بس اتنا کہتا ہے

یہ اک قطرہ اِک ساگر ہے اور ساگر بھی طوفانوں کا

اِس پانی میں دل پگھلا ہے کتنے جلتے ارمانوں کا

جب سب ٹیلہ جل چکتا ہے تب جا کر لاوا بہتا ہے

○

دل کا دل سے ربط حیلے یا وسیلے سے نہیں

جان سے ایمان پہلے ہے یہ دُنیا جان لے

میرے دھانوں کو پھٹک لے، آزمالے چھان لے

قول دے کر ہار دوں میں اُس قبیلے سے نہیں

○

رسیلا خواب، زہری ناگ بھی ہے

فشارِ دردو کارِ چارہ گر بھی

شبِ ظلمت بھی، سیمائے سحر بھی

محبّت آگ بھی ہے، راگ بھی ہے

○

حنا کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نازک ہتھیلی ہے

ترے دامن میں اپنے رنگ لیکن بھر نہیں سکتا

یہ دل کے پھول میں تجھ پہ نچھاور کر نہیں سکتا

کہ تو حسنا (مری محکم محبّت) کی سہیلی ہے

○

جنگلوں میں گھوم سکتا ہوں پیے کھائے بغیر
دلدلوں میں سرسراتے اژدہوں کو چھید کر
ہاں مگر وہ رُوئے زیبا ہو مرے پیشِ نظر
ایک لمحہ بھی گراں اُس کی جھلک پائے بغیر

○

چودھویں کا چاند سیلِ نور برساتا ہُوا
جھونپڑوں میں گرم سازوں، نرم آوازوں کی لے
چاندنی — گیتوں کی لے — یہ جامِ مے اور پے بہ پے
اور پچھواڑے کا رمبوتانؔ مرجھاتا ہُوا

؏ ایک پھلدار پودا

○

یوں دل میں تم سے ملنے کی امّیدیں پلتی رہتی ہیں

اِک نم جیسے رَم کرتا ہے سوکھے اشجار کے سینے میں

جُھلسی ہوئی خنکی ہو جیسے دھونکے ہوئے گرم مہینے میں

یہ لہریں بہتی رہتی ہیں، یہ نہریں چلتی رہتی ہیں

○

"سانپ کی جھاڑی" میں خوشے دھان کے؟

مہر و اِخلاص و مروّت چِین سے؟

"روغنی آواز" ——— خالی ٹین سے؟

واہ حضرت آپ کے ارمان کے!

○

اس سال بھی میل رہے حسنا "گل عالم پور"[1] کے میلے میں

لب، لب سے، دھڑکن، دھڑکن سے، نظریں نظروں سے مل جائیں

پھر دل سے دل کی باتیں ہوں، دل مل جائیں، دل کھل جائیں

"پاڈانگ"[2] کے شور جھمیلے ہیں، "سربان"[3] کے چھدرے بیلے ہیں

○

بسایا تو ہے سنگاپور تو نے — "پورنگالہ"[4]

مگر حسن ملاکا کی جوانی اور ہی کچھ ہے

یہ مٹی اور ہی کچھ ہے، یہ پانی اور ہی کچھ ہے

کہاں دلدل، کہاں گلبن، کہاں کانٹا کہاں لالہ

۱۔ کوالالمپور — ایک مشہور شہر

۲۔ پاڈانگ — میدان، چمن۔

۳۔ سربان — ایک قصبہ کا نام

۴۔ پورنگالہ — سنگاپور شہر کو ایک انگریز ریفلز نے آباد کیا۔ فرنگیوں کو ملایا کے لوگ شروع شروع میں سفید بنگالی کہا کرتے تھے۔

○

جو تیرے غم نے عطا کئے ہیں وہ چاند تارے لُٹا رہی ہوں

یہ میرے کھلیان میرے دل کے حزیں ترانوں سے آشنا ہیں

مرے بیانوں میں رسمساتے ترے فسانوں سے آشنا ہیں

جو گیت ہونٹوں کو تو نے بخشے ہیں میں وہی گیت گا رہی ہوں

○

چاندنی رات کا سمندر ہے

کاش ایسے میں تم بھی آجاؤ؟

راگ سے آگ ہی لگا جاؤ؟

یہ زمیں آج آسماں پر ہے

○

محبت تجھ پہ کیا افتاد آئی؟
دلِ زندہ تجھے یہ ہو گیا کیا؟
کہاں پر مر گیا تو ــــــ سو گیا کیا؟
نہ وہ آیا نہ اُس کی یاد آئی؟

○

اِس میں گلشن ہے، اس میں صحرا ہے
زخم بھی، پھول بھی، ستارے بھی
آب و گرداب بھی، کنارے بھی
دل کی دنیا عجیب دُنیا ہے

○

پھر "برونی"[۱] سے وہی کافر ہوائیں آگئیں

پھر تصوّر کے جزیروں میں بہار آنے لگی

زندگی پھر ایک رنگیں خواب بن جانے لگی

کچھ دھڑکتی ساعتیں، دھڑکا گئیں۔ تڑپا گئیں

○

محبّت برگِ گل پر اوس کے موتی سجاتی ہے

محبّت، زندگی کو زندگی کا رس پلاتی ہے

محبّت، تند طوفانوں پہ ہنستی مسکراتی ہے

کہ ہر طوفان کو یہ ساتھ لے کر ڈوب جاتی ہے

۱۔ برونی۔ جزیرہ بورنیو کی ایک ریاست

○

میرے دل میں اس طرح حُسنا تمھاری یاد ہے

جس طرح پھولوں میں رنگت، جس طرح شاخوں پہ بُور

جیسے ساگر میں جزیرے، جیسے تاریکی میں نُور

ایک جنّت سی خیالوں میں مرے آباد ہے

○

سرگرانی، مہربانی، بدگمانی کے مزے

وہ رگ و پے میں رواں چاندی کے دھاروں پر ہجوم

رُوح میں بے صَوت و بے آہنگ نغموں کا ہجوم

شادمانی، کامرانی — نوجوانی کے مزے

○

وہ آئے بھی مگر ہمیں گھبرا کے رہ گئے

اُن سے بیان قِصّۂ غم کر سکے نہ ہم

شیرازۂ حواس بہم کر سکے نہ ہم

ہونٹوں پہ لفظ کانپ کے تھرا کے رہ گئے

○

انّناس سینے میں سَو زخم کھائے مگر رس اُچھالے مگر رس پلائے

یونہی میرا دل۔ (گرمیٔ آب و گِل)۔ غم کے کتنے بھیانک اندھیرے لئے ہے

مگر ان اندھیروں میں یوں جگمگائے کہ جیسے خوشی کے سویرے لئے ہے

اندھیروں میں چمکے مصائب میں لپکے جدائی میں چہکے حوادث میں گائے

○

بھول جاؤنگی تمھیں – اُس دن – بھُلادونگی تمھیں

ناریل کی شاخ سے خوشہ گرے دریان کا

کوہساروں کی طرف مڑ جائے رُخ طوفان کا

لوحِ دل سے خواب کی صورت مٹادوں گی تمھیں

○

مے نہیں پر مے کو اک نسبت رہے گی جام سے

اجنبی بانہوں میں کیا سچ مچ ہی ڈھل جاؤ گی تم؟

کیا بدل جاؤ گی؟ کیا اتنی بدل جاؤ گی تم؟

حاجیوں کے دل بدل جاتے ہیں کیا احرام سے

○

فلک پر چمکتے رہیں لاکھ تارے
مگر رات پھر سانولی رات ہوگی
اگرچہ یہ تارے بھی ہیں دل کو پیارے
مگر چاند ہوگا تو کیا بات ہوگی

○

دل میں یوں گرنے لگا اک آبشارِ آرزو
چاندنی سے جیسے بھر جاتی ہیں اُجلی وادیاں
نیل کے ساحل پہ جیسے مصر کی شہزادیاں
جیسے کرنوں کا سمندر آئنے کے رُوبرُو

○

نیم عریاں، شوخ الھڑ گل رخوں کی ٹولیاں
ادھ کھلے سینوں پہ "زلفِ تا کمر" کے آبشار
"چاند کے ٹیلوں" پہ کالی بدلیوں کے شاخسار
میٹھے میٹھے قہقہے ہیں پیاری پیاری بولیاں

○

تیری آنکھیں اگر مسکرا دیں ذرا دھان کی کونپلیں مسکرانے لگیں
تیرے ماتھے کا ہنستا طلوعِ سحر میری شب کو اگر روشنی بخش دے
میری راتوں کی یہ بزمِ تابندگی زندگی کو نئی زندگی بخش دے
ریت میں رس بھرے کھیت اُگنے لگیں، سرسرانے لگیں، لہلہانے لگیں

○

میری چاہت اک چمن ہے دلنواز و گلفشاں

بعض گوشوں میں مگر یوں دفن ہیں پھولوں کے راز

ساحلوں کے پاس جیسے ڈوب جاتے ہیں جہاز

اک روش یکسر بہاراں، اک روش یکسر خزاں

○

عشق دل کا راگ، دل کی آگ (مبہم سی مثال)

جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

روشنی جیسے کسی اندھے کے محسوسات میں

جیسے پیغمبر کے دل میں اپنی امّت کا خیال

○

وہ کبوتر ہوں بچھڑ کر اپنی رنگیں ڈار سے

تھک کے آ بیٹھا ہوں اِک بے مہر کے دالان پر

سر بہ زانو اپنی "مشتِ پر" کے ہر ارمان پر

زندگی کی بھیک اک سُوکھی ہوئی دیوار سے؟

○

ہم رازی ہم آوازی بھی، ہم رنگی ہم آہنگی بھی

اِک سادی اُجلی چادر پر یہ جتنے رنگ بھی آئے ہیں

یہ تیری رُوح کے پَرتو ہیں، یہ تیرے پیار کے سائے ہیں

میں چادر سادی سادی بھی، میں چادر رنگ برنگی بھی

○

"سنگامت"[1] کے عظیم الشان ایواں ٹوٹ جاتے ہیں

محبت (دشت کی آواز) روکے رُک نہیں سکتی

یہ گردن کٹ تو سکتی ہے یہ گردن جھک نہیں سکتی

جو قیدی چھوٹنے والے ہیں آخر چھوٹ جاتے ہیں

○

وہ "کرس" بہتر ہے سُچّے موتیوں کی کان سے

جم گیا ہے جس کی دھاروں پر کئی صدیوں کا خوں

جس کی نوکِ تیز نے توڑا "مہابھت"[2] کا فسوں

ڈوب کر نکلا جو ہر بپھرے ہوئے طوفان سے

۱۔ سنگامت ۔ ایک تاریخی مقام

۲۔ مہابھت ۔ جاوا کی قدیم ہندو ۔ بدھ حکومت

○

بس یہی اک عیب ہے میری سبک شمشیر میں
درہم و برہم کلاہ و تخت کر دیتی ہے یہ
جس پہ گرتی ہے اُسے دولخت کر دیتی ہے یہ
ایک جنبش ـــ اور مغفر جا پڑے زنجیر میں

○

کنارے کنارے چلے جانے والو!
ذرا موج و گرداب میں بھی سفینہ؟
یہ جینا بھی ہے کوئی جینے میں جینا؟
سہارے سہارے چلے جانے والو!

○

چھت ہے لمبردار کے گھر کی بہت اُونچی مگر

شب کو اس میں بھی ہے کیڑوں کا وہ شورِ بے اماں

جو ہمارے پست کھپریلوں میں ہے "جزوِ مکاں"

کیا "بلند و پست" سے اُونچی ہے کیڑوں کی نظر؟

○

اِدھر لاؤ کاغذ، دوات اور خامہ

اِدھر آؤ حُسنا لکھیں دو قبالے

کریں خود کو اک دوسرے کے حوالے

(محبت کا خامہ، محبت کا نامہ)

○

سبز پہ والے کبوتر جنگلوں میں اُڑ گئے
یہ اگر مانوس ہو جائیں تو پھر جاتے نہیں
اور اُڑ جائیں تو ظالم لَوٹ کر آتے نہیں
بحرِ بنگالہ کے بادل مڑ گئے تو مڑ گئے

○

ہم کس عالم میں رہتے ہیں، ہم کس دنیا میں بستے ہیں
اک آگ گلوں کے ریشوں میں، اک نَم ان کے رخساروں پہ
یا چاند کی کرنیں رقص کریں گرنے والی دیواروں پہ
ہم اندر اندر روتے ہیں، ہم اُوپر اُوپر ہنستے ہیں

○

اگر طوفان آجائے تو میں "سمپان" بن جاؤں

ترا پر تو، تری خوشبو، ترا رس رنگ ہو جاؤں

اگر تم رقص فرماؤ تو میں آہنگ ہو جاؤں

تمنّا ہے تمہارا دل، تمہاری جان بن جاؤں

○

تری چوٹ سے چوٹ کھاؤں گی میں بھی

"سرمتن" کے دلدل، سمندر کے دھارے

ترے ساتھ میٹھے، ترے ساتھ پیارے

جہاں جائے تو ساتھ جاؤں گی میں بھی

○

کبھی روشنی کی تلاش ہے، کبھی تیرگی کی تلاش ہے
کبھی وادیوں کے نشیب میں، کبھی چوٹیوں کے فراز پر
ابھی ساحلوں کے سکوت میں، ابھی موج موج کے ساز پر
مجھے زندگی کی تلاش تھی، مجھے زندگی کی تلاش ہے

○

جس کی دل پوجا کرے، دل کو وہ مورت چاہیئے
"حسنِ سیرت" سے مقدم تر ہے "جسمانی جمال"
اُف لب و رخسار میں ڈھلتے ہوئے بدر و ہلال
ایک صورت چاہیئے اور خوب صورت چاہیئے

○

اے جاوڑی[1] دوشیزہ تو ہے اک نغمہ ٹھہرایا سا

ایک دھڑکتی مورت، صحت، رنگ، شرابِ جوانی کی

کتنی صدیوں پہ بھاری اک ساعت عمرِ فانی کی

اِک خوشہ انجیروں کا پک کر گرنے پر آیا سا

○

یہ چڑیاں۔ بنگالی چڑیاں۔ ریشم کے پَر والی چڑیاں

پھولوں میں چہکار رہی ہیں، ناچ رہی ہیں، جھوم رہی ہیں

پتّی پتّی پہ لرزاں سی خوشیوں کا منہ چُوم رہی ہیں

من کی اُجلی اُجلی چڑیاں۔ تن کی کالی کالی چڑیاں

---

[1] جاوڑی — جاوا کے باشندے

○

اُس کی پیشانی ۔ (سحر بیدار ہوتے رُوپ میں)

اُس کی آنکھوں میں جکرتہ[۱] کی شرابوں کا سُرور

اُس کے رخساروں پہ یوں انگڑائیاں لیتا ہے نُور

جیسے پھُولوں سے بھرے گلزار روشن دُھوپ میں

○

تنہا بیٹھی ساحل کے دلچسپ ترانے سنتی ہُوں

اِس ساحل سے کس ساحل تک لہریں جاتی آتی ہیں

ٹکراتی، چکراتی ہٹتی پھٹتی رلتی جاتی ہیں

ان کے نغمے سُنتی ہوں اور اپنے "موتی" چُنتی ہوں

۱؎ جکرتہ ۔ بٹاویہ کا انڈونیشی نام

○

فاختاؤں کی طرح مرنے سے کیا ہو جائے گا

میرے ساحل پر قدم دھرنا بڑا دشوار ہے

"شیر کا دل ہے" — یہ سر کرنا بڑا دشوار ہے

بادبانوں میں ہوا بھرنے سے کیا ہو جائے گا؟

○

آج یوں آنکھوں سے بہ نکلا مرے دل کا ملال

جیسے طوفاں کے مسلسل کرب کی زد سے کہیں

تہہ سے ساحل تک اُچھل آتی ہے موجِ تہ نشیں

جیسے خوابوں کی حدوں سے بھی نکل جائیں خیال

○

کوئی کہہ دے یہ غمگساروں سے

دل ہی میں دل کا راز ڈوب گیا

بادباں میں جہاز ڈوب گیا

اب نہ آواز دیں کناروں سے

○

رات گو تاریک ہے طوفان گو پُر شور ہے

آفریں، صد آفریں "ارضِ ملایا کے شباب"

تیری کشتی — آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

تیرا دل پُر عزم — تیرے بازوؤں میں زور ہے

○

جو لباس اُجلا نہیں۔ وہ بیش قیمت ہے تو کیا

لطف و شفقت اصل میں نسوانیت کا لوچ ہے

ورنہ خوں اور گوشت کا یہ لوتھڑا تو پوچ ہے

وہ حسیں عورت نہایت خوبصورت ہے تو کیا

○

محبت کی خاطر سمندر کھنگھالے، محبّت کی خاطر بیابان چھانے

زمیں سے اُڑا آسمانوں میں پہنچا، غباروں میں جھوما، ستاروں کو چُوما

سمندر کی سیّال لہروں میں گھُل کر، ہزاروں طلسمات و ظلمات گھُوما

مگر دل کی گہرائیاں کون سمجھے؟ مگر دل کی اُونچائیاں کون جانے؟

○

گو میں لہروں کی خاموش و حزیں بیٹھا ہوں میں

اس تلاطم زار کے بے چین ارمان اور ہیں

میرے سینے کے خلش افروز طوفاں اور ہیں

اس ہجومِ شور و غل میں کس قدر تنہا ہوں میں؟

○

کہہ رہی ہے تیرے "رنگِ زرد"[۱] کی یہ آب و تاب

گھل گیا خوں میں "سنہراپن" — روانی آ گئی

آگ میں پڑتے ہی سونے پر جوانی آ گئی

یہ طلائی ساغروں میں سرخ پھولوں کی شراب

---

۱ زرد رنگ حسن و شباب کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

○

جب نکلتی ہے دھنک بن کر کوئی کافر جمال

دھانوں، دریانوں، املتاسوں پہ چھا جاتا ہے رنگ

زیست کے بے رنگ ارمانوں پہ آجاتا ہے رنگ

وقت تھم جاتا ہے۔ جم جاتے ہیں "کمپونگوں" میں سال

○

دیکھنے والے مری ہمسائیوں کی مرغیاں

واقعی ان مرغیوں کو دیکھنے آتا ہے تو؟

واقعی ان میں بڑی دلچسپیاں پاتا ہے تو؟

دیکھ اس کھڑکی میں کیا شے ہے حقیقت یا گماں!

○

یوں دل میں پرانے اور نئے ارمان اُلجھتے رہتے ہیں
کچھ شوخ اور مدھم رنگوں کے دھارے جیسے مل جاتے ہیں
یہ متوازی رستے آگے سارے جیسے مل جاتے ہیں
یا جیسے دھان کے کھیتوں میں خود دھان اُلجھتے رہتے ہیں

○

سفید انگرکھے (سنہرے بٹنوں میں) شاہزادوں کے ہیں لبادے
مگر انگرکھوں کی دھڑکنوں میں وہ بادشاہوں کا دل نہیں ہے
قدم یہاں ہے نظر وہاں ہے زباں کہیں ہے بیاں کہیں ہے
ردا یہ سہرے بجا یہ چہرے۔ مگر مروّت؟ مگر ارادے؟

○

میرا دل مندر اور اس مندر کے اندر مورتیں

تا بہ حدِّ ظرف سب سے آشنا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اک اک پر فدا ہو جائیے

مورتوں کے ساتھ ڈھل جاتی ہیں دل کی "صورتیں"[1]

○

دہاتی پیتمہ کے "باجو"[2] ہیں ڈھیلے

کڑی ہیں کمینوں میں لیکن کمانیں

قیامت یہ گولائیاں، یہ اٹھانیں

وہ "باجو" اگر اور بھی تنگ سی لے؟

---

۱ صورتیں یہاں بمعنی کیفیتوں کے استعمال ہوا ہے۔

۲ باجو — کرتہ۔

○

اب زیست مجھے لے آئی ہے حالات کی سخت چٹانوں میں

آشاؤں کے دریاؤں میں، ارمانوں کے طوفانوں میں

اور حُسنا تو بھی جا پہنچی پر دیس کے ظلمت خانوں میں

اب میل کہاں "دریانوں" میں، اب کھیل کہاں کھلیانوں میں

○

تیرے آغوشِ محبّت میں جو ملتا ہے سکوں

نرم رَو لہروں کے خواب آور ترانوں میں نہیں

وہ زمینوں میں نہیں، وہ آسمانوں میں نہیں

وہ سکوں — وہ زندگی کے بیکراں رَس کا فسوں

○

آبادی کا احساس نہ ہو، ویرانے کا افسوس نہ ہو

تنہائی میں آبادی ہو۔ آبادی میں تنہائی ہو

یوں جینے میں زیبائی ہو یوں مرنے میں رعنائی ہو

جینے سے طبیعت سیر نہ ہو، مر جانے کا افسوس نہ ہو

○

آپس میں یوں ہم اور تم ہیں

جیسے "رمتُّوتان کا سایہ

دل میں کسی ارمان کا سایہ

جیسے دھان میں چھپا دل گُم ہیں

○

گھٹائیں جم کر برس رہی ہیں مگر مری رُوح جل رہی ہے

کوئی پرندہ اُڑان کی گرمیوں میں جیسے پگھل چکا ہو

زمیں کا لاوا زمیں کی خنکی کے حاشیے سے نکل چکا ہو

یہ رُوح جو اک خیال کے گرم گرم دھاگے پہ چل رہی ہے

○

جو دھارے میں "سمپان" اپنی اُوپر کے رُخ پہ رکھے جائے

جو موجوں سے لڑ سکتا ہے، گردابوں میں پڑ سکتا ہے

طوفاں کے امنڈتے ریلے میں پتھر کی طرح گڑ سکتا ہے

وہ میری چوڑی لے جائے اور اپنا خنجر دے جائے

○

"کمپونگ" کے لڑکوں بالوں میں یوں دوشیزائیں کھیلتی ہیں

جیسے نہروں کی لہریں ہوں، جیسے پھولوں کے سائے ہوں

جیسے کچھ حوریں اور غلماں جنت سے زمیں پر آئے ہوں

جیسے ساحل کی راتوں میں سرمست ہوائیں کھیلتی ہیں

○

کوئلے کی کان میں کام کرنے والیو!

چین یا سیام کے سانپ کی سنپولیو!

بس بھری مٹھائیو! زرد، سرد، گولیو!

کوئلے کے بوجھ سے ٹوٹتی سی ڈالیو!

○

اثمار کے خوشے پک جانے پر ٹوٹ کے خود آجائیں گے
اشجار کے نیچے دامنِ دل پھیلائے جا، مایوس نہ ہو
دیوار کے پیچھے تڑپے جا، تڑپائے جا، مایوس نہ ہو
جو پنچھی اُڑنے والے ہیں وہ چھوٹ کے خود آجائیں گے

○

بھول کر بھی اب نہ جانا عشق بازی کے قریب
عاشقی کے واسطے حالات اب اچھے نہیں
دوستی کے دوست! امکانات اب اچھے نہیں
اب رقیبانِ محبت ہیں مساجد کے خطیب

○

اپنے خوابوں میں ستارے جوڑتی رہتی ہوں میں

کتنی قندیلیں جلاتی ہوں بجھانے کے لئے

کتنی تصویریں بناتی ہوں مٹانے کے لئے

یہ ستارے جوڑتی اور توڑتی رہتی ہوں میں

○

اپنے دھانوں اور دریانوں کی میں وہ رکھوالی ہوں

جس کا اپنا دل خود بے قابو ہے اپنے سینے میں

چوری ہو جاتا ہے ہر شنبے کی رات مہینے میں

میں چوری کیا روکوں گی میں خود مجرم اقبالی ہوں

○

جن کے لب پہ میری ہمدردی کے افسانے رہے

قُلّۂ کہسار — گردِ زردہ سے نا آشنا

یہ زمیں لیکن زمیں کے درد سے نا آشنا

یہ مرے ہمدرد، میرے دل سے بیگانے رہے

○

وقت کے دھارے کنارے تو بہا کر لے گئے

پھر بھی یادوں کے کناروں پہ دیئے جلتے رہے

یہ دیئے لو پرستاروں کو لئے جلتے رہے

گھپ اندھیرے گو۔ ستارے تو بہا کر لے گئے

○

میرے دُریانوں پہ مت جا، میری آب و گِل کو دیکھ!

"دلدلوں کا نرم شکمہ" — اک اجتماعِ خار و خس"

انگبیں ہی انگبیں - لذّت ہی لذّت، رس ہی رس

دیکھنے والے محبّت دیکھ، میرے دل کو دیکھ!

○

دل میں یوں سایہ فگن ہے عکس اپنی ذات کا

جیسے خم میووں بھری ڈالی کسی تالاب پر

جیسے کیڑے تیرتے پھرتے ہوں سطحِ آب پر

جیسے طوفانی سمندر ہو اندھیری رات کا

○

دُور ــــ غبارِ نُور میں جو منظر ہے کتنا پیارا ہے

ٹاپُو میں جو چیز چمکتی ہے وہ سُچّا موتی ہے

ساحل پر ہیرے کی کنی بھی کھارا پتّھر ہوتی ہے

ٹوٹ کے گرنے سے پہلے جو تارا ہے مہ پارا ہے

○

کر لیا اب مَیں نے اپنے دل کے دروازوں کو بند

جز تمہارے کوئی صورت اس میں آ سکتی نہیں

اجنبی، مانگی ہوئی کرنیں سما سکتی نہیں

زندگی ــــ اب بالاراوہ اِک "شکستِ فتحمند"

○

غنچہ و گل کا باورچی خانوں میں نام نہیں لیتے

دیکھو امّی! آپ کی "رانی" پھولوں کی شہزادی ہے

یہ شہزادی میرے دل کی وادی کی آبادی ہے

ہیرے کے دستے والے خنجر سے کام نہیں لیتے

○

بیٹھ کر گہرائیوں سے پھر ابھر آئیں جہاز

چاند کی کرنوں سے تھم جائے سمندر کا جنوں

گود میں بپھرے ہوئے طوفاں کی مل جائے سکوں

"مر گئے" زندہ ہو نہیں سکتا مگر سینے میں راز

○

کبھی لبریز ہو سکتا نہیں یہ دل کا پیمانہ

محبت مے سہی لیکن "مجسّم مے" نہیں ہوتی

اک ایسی "شے" "بظاہر حسن ہیں کوئی "شے" نہیں ہوتی

محبت زندگی کے رنگ کا ہم رنگ افسانہ

○

ڈالتا ہوں موجِ دریا بار "میں سمپان" کو

بادبانوں میں ہوا نمناک ہے بیباک ہے

آج ہر کشتی نہنگِ مرگ کی خوراک ہے

میرا شیوہ ہے مگر للکارنا طوفان کو

○

یُوں بھی کیا انساں بدل جاتے ہیں؟ — یہ کیا دَور ہے؟

جس طرح دھاگے کی لمبائی میں ڈھل جائے کپاس

جیسے دھاگے کے لپٹتے ہی نکل آئے لباس

جیسے تب کچھ اَور تھا — اور — جیسے اب کچھ اور ہے؟

○

زمانے سے صاحب سلامت ہے میری بڑے رنگ پر بزم آرائیاں ہیں

مگر دل سے دل کی اگر کوئی پوچھے تو اب تک ٹھی ہی دوست ہیں دوست میرے

جنھیں باندھ لائے تھے بچپن کے نغمے (مری زندگی کے وہ پہلے سویرے)

بڑے رنگ پر بزم آرائیاں ہیں مگر دل ہے اور اس کی تنہائیاں ہیں

○

پنانگ[1] کے مخملیں جزیرے میں اک نیا شہر بس رہا ہے

"سفید لائٹ"[2] کے رقص گھر میں قدم قدم تھاپ پڑ رہی ہے

ہمارے ہاتھوں، ہمارے سینوں پر اک نئی چھاپ پڑ رہی ہے

"قدیم دُریان" رو رہا ہے "جدید صد برگ" ہنس رہا ہے

○

کھیل سے مشکل ہے چُننا کھیل کے میدان کا

ہے "قفس" آسان۔ "پروازِ چمن" دشوار ہے

زندگی آسان ہے اُس کا بانکپن دشوار ہے

اپنی کمزوری سے دل بڑھتا گیا طوفان کا

---

[1] پینانگ — مشہور ساحلی شہر جسے مشرق بعید کا موتی بھی کہتے ہیں۔
[2] "سفید لائٹ" سے مراد کیپٹن فرانسس لائٹ جس نے پینانگ آباد کیا تھا۔

○

ناریل کا جھنڈ جتنا ہو بلند

اُس سے اُونچی جائے گی سینے کی آگ

(آگ میں پگھلے ہوئے سیّال راگ)

عشق میں کیا جبرِ ضبط و قید و بند؟

○

اپنے دامن میں چاول نہ جو لا سکیں دھان ایسے اُگانے سے کیا فائدہ؟

وہ تنک ظرف جنگل کا جوہڑ بھی کیا جس میں پانی تو ہو پر روانی نہ ہو

اُس شعورِ جوانی پہ پھٹکار ہو جس جوانی میں رنگِ جوانی نہ ہو

ایسے "نامرد" مردوں کو ڈاڑھی کے دو چار تنکے سجانے سے کیا فائدہ؟

○

وقت کے پردوں میں تابندہ ہیں یوں "نام و نشاں"

جیسے دُریانوں کے جھرمٹ میں ابابیلوں کے پر

اجنبی ساحل پہ دھوئے دھوئے، اُجلے اُجلے گھر

یا "سراوک"[1] کے حسیں چیتوں کی رنگیں دھاریاں

○

اب پاسِ زشت و خوب کہاں، احساسِ زشت و خوب گیا

افلاس کی دلدل میں ساحل کی قدریں کیا محفوظ رہیں

مرنے کی نظر میں جینے کے آداب کہاں ملحوظ رہیں

پانی گدلا تھا یا اُجلا ـــ جو ڈوب گیا سو ڈوب گیا

---

[1] سراوک ـــ بورنیو کا ایک حصّہ

○

مرے سینے میں محسوسات کا سورج دمکتا ہے
کہ کشتِ زندگی میں بیج بوتا ہوں مروّت کے
صداقت کے، رفاقت کے، شرافت کے، محبّت کے
نگاہِ اہلِ دنیا میں فقط سونا چمکتا ہے

○

ہجومِ رنگ و رامش میں عبث یہ رو رہا ہوں میں
جو میرے دل میں ہے اُس درد کو ہمدرد کیا جانیں
وہ میرے اشکہائے گرم و آہِ سرد کیا جانیں
زمینِ شعر میں جو بو رہا ہوں کھو رہا ہوں میں،

○

گاؤں کی الھڑ "پنیہاؤں" کے نغمے کھیل میں
شب کے سنّاٹوں میں جیسے چاندنی گاتی ہوئی
نو دمیدہ شاخساروں کو ہنسی آتی ہوئی
جیسے "باؔلی" میں کوئی "اشنان" گھی میں، تیل میں

○

یہ بات نہیں ہے کہ ملاقات نہیں ہے
لیکن وہ ہمہ جذبِ ملاقات کا عالم؟
سوئے ہوئے ٹھہرے ہوئے دن رات کا عالم؟
اب تیری ملاقات میں وہ بات نہیں ہے

○

مہر و شفقت کی فضائیں دل میں یوں رقصندہ ہیں

جیسے "رمبوتان" کے سائے میں اُجلے یاسمن

جیسے یادوں کے جزیرے، جیسے خوابوں کے چمن

میرے محسن قبر کی ظلمت میں بھی تابندہ ہیں

○

زرکار دوپٹے کا آنچل جھٹکا بھی دے لہرا بھی دے!

سینے میں جو شعلے بھڑکے ہیں مشکل ہی رہیں گے سینے میں

اک روز یہ لَو دے اُٹھیں گے آنکھوں کے جلی آئینے میں

جو گیت رگوں میں بہتا ہے، وہ جیون گیت سنا بھی دے!

○

میں اپنی تنہا راتوں میں کچھ ایسے گیت بھی گاتی ہوں
الفاظ کا جن پہ بوجھ نہیں، اسلوب کا جن پہ زنگ نہیں
سُرتال — مگر سُرتال نہیں۔ آہنگ — مگر آہنگ نہیں
اِس بے پایاں موسیقی کی لہروں میں گُھل مل جاتی ہوں

○

حالات اندھیری رات سہی حالات پہ کب تک رونا ہے
تم آؤ تو ان حالات میں بھی کچھ "روشن ساغر" پی لیں ہم
جو مہلت موت نے بخشی ہے اُس مہلت میں تو جی لیں ہم
موت آئے گی — مر جائیں گے — جو ہونا ہے سو ہونا ہے

○

اپنی آنکھوں کی مئے گلرنگ پینے دے مجھے

کل سمندر میں خدا معلوم کیا طوفان ہو؟

کون جانے، کونسے ٹاپو میں یہ "سمپان" ہو؟

آج جینا چاہتا ہوں آج جینے دے مجھے

○

ہنسنے والو روتی ہوں میں جب سے گیا ساجن "سُرابایا"

قصبے کے سوداگر کی کشتی میں بھرے ساماں کے توڑے

چین کے ریشم سی گاؤں کے "بُت" "ای پُو" بنکاک کے گھوڑے

کتنے جانے والے۔ آئے لیکن ابتک وہ نہیں آیا

۱؎ سُرابایا۔ جاوا کا شہر سورابایا

○

دل میں یوں دل کے داغ جلتے ہیں

جیسے پُوجا کے وقت تھالوں میں

لڑکیوں کے حسیں خیالوں میں

ننّھے ننّھے چراغ جلتے ہیں

○

مانا کہ حوادث کی موجوں سے دل کے کنارے ٹوٹ گئے

کیا کم ہے یہ اطمینان مگر، ہے عشق کی لذّت جینے میں

جو "درد" کہ "نور" ہے سینے کا وہ درد بھرا ہے سینے میں

اِس رات میں تارے چمکے تو — ہر چند بچارے ٹوٹ گئے

○

یہ نہ پوچھو کون ہے حُسنا یہ پوچھو کیا ہے وہ

حُسنِ فطرت پہ تبسّم کھیلنے آیا ہُوا

ایک نغمہ پیکِ آب و گل میں ٹھہرایا ہُوا

یہ نہ پوچھو کون ہے حُسنا یہ پوچھو کیا ہے وہ

○

دُور، دُور، دُور —— ہم سے دُور چلنے والیو!

دل میں ہمارے جھک کر دیکھو ـــ دیکھو! دل میں کون ہے؟

اِس منزل پہ رُک کر دیکھو ـــ اِس منزل میں کون ہے؟

دُور، دُور، دُور —— ہم سے دُور چلنے والیو!

○

کھیتوں میں گھاس اُونچی ہو گئی ہے دھان ہے

جسم سے شاخوں کے پتّے تھرتھرا کے جھڑ گئے

پھُول سے لب، چاند سے رُخسار نیلے پڑ گئے

کب ملے گی "جان" — اپنی "جان کے ارمان" ہے

○

تو البیلی میں البیلا۔ تو متوالی میں متوالا

دونوں دل ہیں ملنے والے لیکن کیا یہ مل بھی سکیں گے؟

کیا یہ غنچے کھلنے والے اِس موسم میں کھِل بھی سکیں گے؟

جس میں گلشن بِک جاتے ہیں، غنچہ و گُل سے بالا بالا

○

انتاس کی وادیوں میں جو ندّی خراماں، خراماں چلی جا رہی ہے

بہاؤ میں پھولوں کے گجرے بہائے، بہاؤ میں تاروں کے دیپک جلائے

ہوا کے ترانے، فضا کے فسانے، اُجالوں کے پرتو، گھٹاؤں کے سائے

یونہی "عشق کی دھڑکنوں سے لپٹ کر" جوانی کی وارفتگی جا رہی ہے

○

انتاس سینے میں سو زخم کھائے مگر رس اُچھالے مگر رس پلائے

یونہی میرا دل۔ (اگر مٹی آب و گل)۔ غم کے کتنے اندھیرے لئے ہے

مگر ان اندھیروں میں یوں جگمگائے کہ جیسے خوشی کے سویرے لئے ہے

اندھیروں میں چمکے، مصائب میں لہکے، جدائی میں چہکے، حوادث میں گائے

○ بسایا تھا جب ہم نے شہرِ ملا کا

○ رخصتِ جنگ

(حمزہ براسی)

ملاکا — دو صدیوں تک سلاطینِ ملایا کا دارالحکومت اور اس ملک کی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے۔

یہ شہر اپنے سہانے سمندر، بارونق ساحل، شفّاف نہروں، اور گرد و پیش کی زمرّدیں زاویوں میں لہلہاتے ہوئے دھانوں کے لیے مشہور رہا ہے۔ سنگاپور کی تجارتی و سیاسی اہمیت نے اگرچہ اب ملاکا کی عظمت کم کر دی ہے۔ تاہم اب بھی یہ شہر ملایا کا "دل" سمجھا جاتا ہے۔ اس مُلک کی اکثر مشہور داستانہائے عشق اسی شہر اور انھیں وادیوں سے منسوب ہیں۔

ملاکا — ملایا کا گجرات ہے۔

یہ نظم در اصل اُن غزلیہ نوحوں میں سے ایک ہے جو سلاطینِ ملاکا کے زوال پہ لکھے گئے۔

بسایا تھا جب ہم نے شہرِ ملاکا

بساطِ زمیں غیرتِ آسماں تھی

یہ دُنیا حسیں تھی یہ دُنیا جواں تھی

جوانوں کے ماتھوں پہ ہنستے سویرے

حسینوں کی آنکھوں سے مستی عیاں تھی

اُڑاتے تھے ہم بادبانوں کے پرچم
اِک اِک موج پر اپنی کشتی رواں تھی

اُترتے تھے یاں روز دھانوں کے توڑے
تجارت کی مصروف منڈی یہاں تھی

سمندر ہمارا تھا، لہریں ہماری
ہوا دلکشا تھی، فضا ہم عناں تھی

کوئی "اجنبی زخم" کھایا نہیں تھا
قوی ہم تھے تقدیر بھی مہرباں تھی

بسایا تھا جب ہم نے شہرِ ملاکا۔

سنگاپور
اگست ۱۹۴۶ء

سترھویں صدی میں شاہِ برما نے ملایا کی سرحدی ریاست قدح پر لشکر کشی کی تھی۔ حمزہ کے ان اشعار میں اسی جنگ کی طرف اشارہ ہے

الوداع پیاری پتیمہ الوداع

بج گیا ہے "قدح" میں طبلِ جہاد
کہہ رہا ہے میرا سلطاں مجھ کو یاد

چھڑ گئی ہے حاکمِ برما سے جنگ
ہم پہ چڑھ دوڑا وہ بدخو بدنہاد

پڑ گئی مسجد کے نقاروں پہ ضرب
امتحاں میں ہیں ہمارے اعتقاد

بول تو بھی آج میرے ساتھ بول
عزم و حزمِ نوجواناں، زندہ باد

میری جاں! تلوار میری لا بھی دے
تیر و ترکش کو ذرا چمکا بھی دے
مجھ کو جو پہنچی مرے اجداد سے
زہر اُس شمشیر کو پلوا بھی دے
مسکرا کر وہ زرہ بکتر اُٹھا
اپنے ہاتھوں سے اسے پہنا بھی دے
روک لے اِن آنسوؤں کو روک لے
گا بھی دے اب کوئی نغمہ گا بھی دے
الوداع پیاری پتیمہ الوداع

سنگاپور
ستمبر ۱۹۴۶ء

جدید انڈونیشیا کا ایک گیت

چُنری — انڈونیشیا کے ایک جدید شاعر فور ٹُشمسُو کا لکھا ہُوا مقبولِ عام گیت ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبوں پر انڈونیشی عورتیں اس گیت کو بڑے مزے سے گاتی ہیں

قوسِ قُزح کے رنگ اُڑا کر اک چُنری بُن ڈالی ہے

دل کی یہ گُلکاری، یہ پھلواری دیکھنے والی ہے

گہرے، سُرخ، سنہرے دھاگے، سوئے سوئے، جاگے جاگے

ہر پتّی اِک سندر مکھڑا۔ ہر ڈالی متوالی ہے

نازک موڑوں، لہری لہروں میں سپنے لہراتے ہیں

اِن جوڑوں، موڑوں میں دل نے اک دُنیا بُن ڈالی ہے

اپنے خوابوں میں بہتے میٹھے چشموں کے چھینٹوں سے

دل میں جو صورت پنہاں تھی اِن بُوٹوں میں پالی ہے

رنگیں نازک دھاگوں کو تخییل نے جو تصویریں دیں

سکھیاں کہتی ہیں ان میں یہ جگجا ہے، وہ بالی ہے

رنگوں کا جُھرمٹ بھی ہے، یک رنگی ہم آہنگی بھی

لال کناری لیکن سب سے پیاری ہے، اُجیالی ہے

اِس ڈوری میں شاید دل نے پیار کی لالی ڈالی ہے

ملیر
۱۹۵۲ء

اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساز پر

چند طبعزاد منظومات جو انہیں رنگین
جزیروں میں کہی گئیں اور جو فضا و تاثر
کے اعتبار سے اسی مجموعہ کا جزو ہیں۔

رقصِ فیروزی

(ھُونٹ بیٹن کلب سنگاپور کی ایک فاصلہ رات)

بہرسو "بار"[1] دریا بار تھی کل شب جہاں میں تھا

کہ ساقی خود "بڑی سرکار" تھی کل شب جہاں میں تھا

فروزاں آتشِ رخسار تھی، کل شب جہاں میں تھا

وہ محفل — محفلِ انوار تھی کل شب جہاں میں تھا

خدا کی حمد کی صورت ترانے ناخداؤں کے

یہ دنیا کتنی دنیا دار تھی، کل شب جہاں میں تھا

---

[1] فرنگی انداز کا شراب خانہ

جوانی اور کافر ہو رہی تھی مستیٔ مے سے

قیامت لغزشِ رفتار تھی کل شب جہاں میں تھا

ہوا، موجِ سرور افزا، ہمہ نکہت، ہمہ لذّت

فضا جھنکار ہی جھنکار تھی، کل شب جہاں میں تھا

بلا نوشی، جنوں کوشی، بہم دوشی، ہم آغوشی

یہ سب بے ہوشی بڑی ہشیار تھی، کل شب جہاں میں تھا

لبوں کا ہر حسیں اقدام، بانہوں کی ہر اک جنبش

یہ ایمائے نگاہِ یار تھی، کل شب جہاں میں تھا

ہجومِ شعلہ رخساراں، بہر جا مے، بہر گا مے

یہ شب اک "جنّتِ دیدار" تھی کل شب جہاں میں تھا

دلوں کی دھڑکنیں یک تال و یک آہنگ تھیں باہم
نگاہِ یار دل کے پار تھی، کل شب جہاں میں تھا

خیالوں کی چمکتی وادیوں میں دُور تک، جیسے
روش جو تھی، گل و گلزار تھی، کل شب جہاں میں تھا

شراب آلودہ شب کی چاندنی کے آبشاروں میں
بساطِ زندگی بیدار تھی، کل شب جہاں میں تھا

زِ فیضِ عامِ مے خانہ، زِ کیفِ رقصِ مستانہ
ہوس گرمِ نشاطِ کار تھی، کل شب جہاں میں تھا

خراماں تھیں خیال و خواب کی شہزادیاں ہر سُو
بہشت اک "سایۂ رخسار" تھی، کل شب جہاں میں تھا

یہ فانی زندگانی وقت سے سرمستیاں لے کر

زمیں تا آسماں گلزار تھی کل شب جہاں میں تھا

علی الرّغمِ حوادث زندگی با جشنِ سلطانی

جوانی کی علمبردار تھی، کل شب جہاں میں تھا

بہ رنگِ گردشِ جامِ مسلسل، گردشِ دوراں

مری غمخوارہ میری یار تھی، کل شب جہاں میں تھا

مروّت کی نشیلی آنکھ چمکیلی توجہ سے

ہمہ بیتابیٔ اظہار تھی، کل شب جہاں میں تھا

نہ معذوری نہ مجبوری نہ محرومی، نہ لاچاری

اگر تھی بھی پسِ دیوار تھی، کل شب جہاں میں تھا

"بنامِ رقصِ فیروزی" — "بجامِ جشنِ نوروزی"

جوانی ہر گلے کا ہار تھی، کل شب جہاں میں تھا

فرنگ و ایشیا ہم رقص و ہم آغوش تھے دونوں

تمیزِ رنگ و خوں ہموار تھی کل شب جہاں میں تھا

وہی میں پھر وہی ڈستی ہوئی ویرانیاں میری

یہ دنیا کس سمندر پار تھی؟ کل شب جہاں میں تھا

سنگاپور

۱۹۴۵ء

ایک اجنبی جزیرے میں

حسن و رنگ و نور کا دریا ہے میرے سامنے
اک نیا ساحل، نئی دنیا ہے میرے سامنے
دیس کی سلمیٰ و عذرا و زلیخا کا جواب
جوزی و مریانہ و مریا ہے میرے سامنے
جھلملاتے شوخ "سارونگوں" میں یہ شاداب جسم
رقص میں یا ساغرِ صہبا ہے میرے سامنے

خوابِ آغازِ جوانی پیکروں میں ڈھل گیا

دل میں جو پنہاں تھا وہ پیدا ہے میرے سامنے

پرورش کرتے رہے جس کی مرے خواب و خیال

وہ خیال و خواب کی دنیا ہے میرے سامنے

موت سے کہدو ذرا بیرونِ در ٹھہری رہے

زندگی کی محفلِ رعنا ہے میرے سامنے

رقص و نغمہ، حسن و مستی، عشق و فرصت، جام و مے

اک "شبستانِ الف لیلیٰ" ہے میرے سامنے

پھول داماں و گریباں ہیں نظر میں دل ہیں پھول

بہرِ گلچینی چمن پھیلا ہے میرے سامنے

دیکھ! ابھی مت چھیڑ کوئی قصۂ بے کیف و تلخ
دیکھ! ابھی تو ساغر و مینا ہے میرے سامنے

ہر حسیں پیکر سے ہیں لپٹی ہوئی یادیں تری،
میں سمجھتا ہوں مری مجسمہ ہے میرے سامنے

زندگی کی تلخیوں کو اے ضمیرؔ آواز دو
زندگی کا راز بے پردا ہے میرے سامنے

(جزیرہ پلوبرانی)

جنوری ۱۹۴۶ء

مردیکا

"مردیکا" انڈونیشی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی آزادی کے ہیں۔ انڈونیشیا کے جہادِ حریت میں یہ لفظ انڈونیشی محب الوطنوں کا ایک پر جوش نعرہ بن گیا تھا۔

۵۴ء کے "ہری رایا پواسا" (عید الفطر) کے موقعہ پہ جاکرتہ یونیورسٹی کی نوجوان طالبات نے اپنے ایک عظیم الشان جلوس میں پہلی مرتبہ آزاد انڈونیشیا کا سرخ و سفید پرچم جاوا میں بلند کیا۔ یہ اشعار اسی تاریخی واقعہ کی یادگار ہیں۔

آج اِس وادیٔ گلپوش کی سلماؤں نے
اپنے فردوس کے آزاد علم لہرائے
وادیاں جن کی گرج سُن کے لرز اُٹھتی تھیں
گیت اُن شیروں کے، نازک سے لبوں نے گائے

اب بھی "کمپونگ" میں رقصاں ہیں شرارے جن سے
نرم ہونٹوں نے وہ شعلے، وہ دیئے برسائے
جن میں آنسو ہیں ملاکا کے شہنشاہوں کے
آج وہ گیت، وہ "پنتون" اُبھر ہی آئے
جن کی چنگاری کسی قوم کا عنوان بنے
ان حسیں آنکھوں میں وہ عزم فروزاں پائے

آفریں! پاک جزیرے کی جواں سلماؤ!
تُم جزیرے کی بہاروں کو لیئے آتی ہو

اپنے اِس پرچمِ گُل رنگ کی برنائی میں
تم نئے چاند ستاروں کو لئے آتی ہو
زندگی بن کے جو بھڑکیں گے جزیرے میں کبھی
اُن فضا تاب شراروں کو لئے آتی ہو
اجنبی ظلم کی حدت میں جو دم توڑ گئیں
پھر انہیں مست بہاروں کو لئے آتی ہو
جن سے وابستہ ہے سوئے ہوئے مشرق کی نجات
اُن کناروں کو، سہاروں کو لئے آتی ہو

چینی سالِ نَو

چینیوں کے سالِ نَو کا جشنِ خاص و عام دیکھ
دیدنی ہے دوست سنگاپُور کی یہ شام دیکھ

اُجلے ایوانوں میں بل کھاتے ہوئے نغمات سن!
رقص کرتی خلوتوں میں لڑکھڑاتے جام دیکھ

مطمئن چہروں پہ اک خوشحال مستقبل کی ضو
دامنِ شب میں طلوعِ صبح کا ہنگام دیکھ

آٹھ سالوں کی مسلسل تلخیوں کی یاد میں

والہانہ مستیوں کا یہ حسیں اہتمام دیکھ

شوخ آنکھوں کی سنہری چلمنوں سے جھانکتا

عزمِ محکم، اعتمادِ تازہ کا پیغام دیکھ

سامنے جس کے غلاموں کی بہارِ صبح فق

دیکھ! یہ آزاد قوموں کا فروغِ شام دیکھ!

دوست! کیا میرے وطن میں بھی یونہی آتا ہے سال؟

ہالینڈ پارک، سنگاپور

فروری ۱۹۴۶ء

سکوتِ غزلخواں

کسی کی زلفِ پریشاں کو دیکھ آئے ہیں

ہجومِ سنبل و ریحاں کو دیکھ آئے ہیں

پھر اُس کی چشمِ پشیماں کو دیکھ آئے ہیں

چراغِ محفلِ امکاں کو دیکھ آئے ہیں

حجابِ شرمِ فراواں کے پردے پڑے ہیں

کسی کے جسمِ نمایاں کو دیکھ آئے ہیں

چمک چمک کے جو آنکھوں میں ڈوب جاتا تھا
اُس التفاتِ گریزاں کو دیکھ آئے ہیں

بہ سعیٔ خاص جھکائی گئی نگاہوں میں
کسی کی پرششِ پنہاں کو دیکھ آئے ہیں

نظر شراب، جبیں چاند، ہونٹ برگِ گلاب
ہم ایک خوابِ خراماں کو دیکھ آئے ہیں

وہ رُخ پہ سیم و شفق، امتزاجِ شام و سحر
طلوعِ صبحِ گلستاں کو دیکھ آئے ہیں

لب و جبیں پہ جو آ آ کے لوٹ جاتا تھا
پھر اُس "تبسمِ گریاں" کو دیکھ آئے ہیں

نفس نفس میں وہ حشرِ سکوتِ گویائی
نظر نظر میں چراغاں کو دیکھ آئے ہیں
بعید شرق کے رنگیں طلسم زاروں کی
قدیم نبتِ سلیماں کو دیکھ آئے ہیں
کنارِ رودِ ملاکا کی ایک بستی میں
ہم اپنے خواب کو، ارماں کو دیکھ آئے ہیں
اگر "سکوتِ غزلخواں" کو دیکھ سکتے ہیں
تو ہم "سکوتِ غزلخواں" کو دیکھ آئے ہیں

پینانگ
اکتوبر ۶۴ ۱۹ء

دُریانوں کا موسم

"دُریان" — مشرقِ بعید کا مشہور و مرغوب میوہ ہے۔ شروع شروع میں غیر ملکیوں کو اس کا ذائقہ خاصا ناگوار معلوم ہوتا ہے مگر رفتہ رفتہ کام و دہن اس کی لذّت سے مانوس ہو جاتے ہیں۔

"دُریان" کو وہاں کا "آم" سمجھیے — کھانے کے معاملہ میں بھی اس کا پُورا لطف آم کی طرح کچھ "شور بور" ہو کر ہی کھانے میں آتا ہے۔ ڈریانوں کی فصل کا جوبن بھی موسمِ برشگال میں نکھرتا ہے۔

ساون آیا اور بازاروں میں دُریان آ گئے
آرزو انگیز خوشبوؤں کے طُوفان آ گئے
جاگ اُٹھا دُور پُورب کے جزیروں کا فسوں
آسماں سے کیف و سرمستی کے فرمان آ گئے

کیا گھٹاؤں نے چھپا رکھا تھا سینے میں انھیں؟

پہلی بدلی کا برسنا تھا کہ دُربان آ گئے

ساحلوں پر شام کی پریوں کے جھرمٹ بڑھ چلے

شہر میں چوکوں کی رنگینی کے سامان آ گئے

ہر گلی، ہر گھر میں شیریں محفلیں جمنے لگیں

ہر گلی، ہر گھر میں یہ موسم کے مہمان آ گئے

حُسن کافر کی ادائیں اور کافر ہو گئیں

عشق کی دیوانگی کے اور عُنوان آ گئے

دیس سے وابستہ ہے جن پاک ارمانوں کی یاد

آج آنسو بن کے آنکھوں میں وہ ارمان آ گئے

ساحل موار (ملایا)
۱۹۴۶ء

اِعتراف

خلدِ انڈونیشیا کی دُخترِ زُہرہ جمال!

کتنی بھولی کس قدر معصُوم ہے سادہ ہے تُو

اِک فریبی اجنبی رہ آشنا کے واسطے

میری خاطر یعنی مجھ سے بے وفا کے واسطے

اِن جزیروں کو بھی تج دینے پر آمادہ ہے

میرے ٹیلے میرے صحرا تیرے مسجودِ خیال

خلدِ انڈونیشیا کی دُخترِ زہرہ جمال!

تو سمجھتی تھی جسے اظہارِ عشقِ جاوداں
وہ تری آنکھوں کی مستی کے سوا کچھ بھی نہ تھا
میری جام و رُخ پرستی کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ساحلوں کی چاندنی راتوں کا سحرِ بے اماں

اک طلسمِ "باجو و سارونگ" و سحرِ ماہ و سال
خلدِ انڈونیشیا کی دخترِ زُہرہ جمال

سخت مشکل ہے زباں کو دل بنا سکتا نہیں
اجنبی، راہی، سپاہی کیا اور اُس کا پیار کیا؟
ڈوبتی کرنوں کا رقصِ سایۂ دیوار کیا؟
میں اگر آنا بھی چاہوں گا تو آ سکتا نہیں

ایک دردِ مستقل اس ربطِ لمحی کا مآل
خلدِ انڈونیشیا کی دُخترِ زہرہ جمال

دل تو گو تیرے خیالوں ہی سے بہلاؤں گا میں
اجنبی لشکر نہیں رُکتے، چلا جاؤں گا میں
لیکن اے میری محبّت کی مقدّس میزباں!
ان سنہرے ٹاپوؤں کے گیت دُہراؤں گا میں

اپنے خوابوں میں بُنوں گا تیرے "کمپونگوں" کے جال
خلدِ انڈونیشیا کی دُخترِ زہرہ جمال

تو کہ ہے تیرا وطن دُنیا پہ فردوسِ بریں
نیلم و گوہر کی دُریا نوں کی دھانوں کی زمیں
یہ طمانیت یہ فرصت، یہ فراغت یہ سکوں؟
یہ بہشتیں جن میں جلنے سے سوا مرنا حسیں
تُو نہیں واقف مرے ماحول کے اِفلاس سے
تُو نے اک "کپتان" دیکھا ہے "مجھے" دیکھا نہیں

میرے ٹیلے میرے صحرا تیرے مسجُود خیال
خلدِ انڈونیشیا کی دخترِ زہرہ جمال

دسمبر ۱۹۴۷ء

اِنتساب

اے کہ تیرے نام تک سے بھی ہوں ناواقف، مگر

تیری یادوں کو رگ و پے میں بسا لایا ہوں میں

آتشیں رُخسار کی لَو، شربتی آنکھوں کی ضَو

اپنی راتیں اِن ستاروں سے سجا لایا ہوں میں

سرسراتی تھیں جو تیرے اجنبی ملبُوس میں

اُن تصوّر کی بہاروں کو اُڑا لایا ہوں میں

جن سے گزرے تھے تری رعنائیوں کے کارواں

دل میں اُن رستوں کی دولت کو دبا لایا ہوں میں

اے کہ تیرے نام تک سے بھی ہوں ناواقف، مگر

تجھ کو، جیسے تجھ سے بھی چوری ـ چھپا لایا ہوں میں

(جہاز جارجیک میں)

جنوری ۱۹۴۸ء

ساقی کے اہتمامِ گل و مُل کے باوجود
ہم پر بھی آفریں کہ ہم ارزاں نہ ہو سکے

بیادِ وطن

ملآیا کے مناظر گو بہت ہی خوب ہیں لیکن

وطن! پیارے وطن! ہیں تیرے نظّارے نہیں بھولا

تری راتیں، تری راتوں کے مہ پارے نہیں بھولا

برس لینے پہ ساون کی دُھلی، خاموش راتوں میں

وہ سوئی سوئی رُت، وہ جاگتے تارے نہیں بھولا

چراگاہوں کے ہنستے، بولتے گاتے ہوئے دامن

حسیں فطرت کے وہ معصوم گہوارے نہیں بھولا

ملآیا کی حسینائیں بھی گو محبوب ہیں لیکن

میں اُن بے عیب رخساروں کے انگارے نہیں بھولا
گھنی پلکوں سے رِستے ٹوٹتے تارے نہیں بھولا
وہ موسیقی کہ آنکھوں میں چمک کر بول پڑتی ہے
میں اُس خاموش موسیقی کے شہ پارے نہیں بھولا
بھرے چوکوں میں الھڑ شوخیاں مرغوب ہیں، لیکن
وہ چُھپتی "بجلیوں" کے نرم "لشکارے" نہیں بھولا

ملایا کے مناظر گو بہت ہی خوب ہیں لیکن
وطن! پیارے وطن! میں تیرے نظّارے نہیں بھولا

کیمپ بدادری
۱۹۴۶ء

آزادیِ وطن پر

(ایک تاثّر جو مکمّل نہ ہو سکا)

جن کے دروازے تھے دو صد سال سے مشرق پہ بند
آ گیا مشرق کے اُن خاموش میخانوں پہ رنگ
پی گئی تھی جن کی شادابی کو آقاؤں کی پیاس
پھیلتا آتا ہے اُن بے آب ویرانوں پہ رنگ

پڑ چلی دم توڑتی مجروح امّیدوں میں جان

آ گیا سہمے ہوئے مایوس ارمانوں پہ رنگ

چھپ اندھیرے میں ورائے آتشیں تاروں کے غول

نور کے زینوں سے اُترا اپنے ایوانوں پہ رنگ

ایشیا خوش ہو کہ اے مظلوم انسانوں کی خاک!

تیرے فرزندوں کے پرچم پرفشاں ہونے لگے

مژدہ! اے مشرق ترے دامن سے اک مدّت کے بعد

عظمتِ انساں کے چشمے پھر رواں ہونے لگے

تپ رہے تھے آج تک جو ایشیا کی آگ میں

پھیل کر وہ گرم ذرّے بے کراں ہونے لگے

پرورش کرتا رہا جن کو غریبوں کا لہُو

آج وہ باغی اِرادے کامراں ہونے لگے

کوالالمپور (ملایا)

۱۶- اگست ۴۷ ۱۹ء

چند اشعار

ہم اس جہاں میں رہ کے رہے اس جہاں سے دُور
منزل سے تھے قریب مگر کارواں سے دُور

وہ چشمِ مست و زُلفِ دراز و رُخِ ملیح
ہندوستاں ملا مجھے ہندوستاں سے دُور

رخصت بُتانِ چینؔ و ملایاؔ مرے لئے
اِک دل دھڑک رہا ہے وطن میں یہاں سے دُور

دل اب بھی ڈھونڈھتا ہے اُسی کو جو ہے ضمیرؔ
دُور اور اتنی دُور کہ وہم و گماں سے دُور

(جہاز جارجیک میں)

جنوری ۱۹۴۸ء

سلام اے ملایا!

ترے خلد زاروں میں گیت اپنے گا کر
ترے ساحلوں پر ستارے لٹا کر
محبّت کے خاموش دیپک جلا کر
کبھی خود پہ رو کر، کبھی مسکرا کر

مسافر سپاہی چلے جا رہے ہیں
سلام اے ملایا۔ سلام اے ملایا

بہت تیرے دلکش نظاروں نے روکا
"سرونگوں" کی کافر بہاروں نے روکا
زمیں پر اُتر کے ستاروں نے روکا
بہر گام کتنے سہاروں نے روکا

مگر پھر بھی راہی، چلے جا رہے ہیں
سلام اسے آ ملایا۔ سلام اسے ملایا

نگاہوں سے دل کے ارادے لُٹاتے
خیالوں میں یادوں کے پرچم اُڑاتے
حوادث میں بھی جھومتے، مُسکراتے
کوئی نام لیتے، کوئی گیت گاتے

مسافر سپاہی چلے جا رہے ہیں
سلام اے ملایا۔ سلام اے ملایا

گُلوں کو بہارِ چمن سب سے پہلے
غزالوں کو دشت و دَمن سب سے پہلے
مجاہد کو تیغ و کفن سب سے پہلے
سپاہی کو اپنا وطن سب سے پہلے

وطن کے سپاہی چلے جا رہے ہیں
سلام اے ملاؔیا۔ سلام اے ملاؔیا

کمپونگ بارو
۱۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء

ایک یادگار

اگرچہ جبر کے ہاتھوں نے ڈھا دیا ہے تجھے
بہ زعمِ خویش کسی نے مٹا دیا ہے تجھے

طلوعِ صبحِ وطن عظمتِ وطن کی قسم
تجھے مٹا کے بھی تجھ کو مٹا نہیں سکتے

جو آگ بھر دی خیالوں میں تیرے ذرّوں نے
اب اُس کو وقت کے جھونکے بجھا نہیں سکتے

قسم، دلوں میں نئے جاگتے ارادوں کی
رُلانے والے بھی اب مسکرا نہیں سکتے

قسم ہے ذلّتِ احساسِ بےبسی کی، یہ سر
کٹا تو دیں گے مگر اب جُھکا نہیں سکتے

گواہ رہنا ملایا کی نرم رَو لہرو!
کہ اِس کنارے مرے کارواں پھر آئیں گے
اُبھر رہی ہیں جو شمعیں ہمالیہ پہ ابھی
انھیں بلند کیے نوجواں پھر آئیں گے

تجھے بنائیں گے پھر "یادگارِ دردِ وطن"
تلاشِ ضو میں سوئے خاوراں پھر آئیں گے
جبیں سے دھونے کو "پچھلی ندامتوں" کے داغ
اُتار کر یہ "کفن" ہم یہاں پھر آئیں گے

خموش جنبی ساحل پر اے وطن کے نشاں
تجھے وطن کی نگاہیں سلام کہتی ہیں
یہ آنسوؤں کے ستارے جو گر نہیں سکتے
یہ ضبط کی ہوئی آہیں سلام کہتی ہیں

گزر کر آئیں گے جن پر سے کارواں اپنے

بجھی بجھی سی وہ راہیں سلام کہتی ہیں

تجھے بنائیں گے جو اس طرح کہ مٹ نہ سکے

وہ خوں، وہ جوش وہ باہیں سلام کہتی ہیں

خموش اجنبی ساحل پہ اے وطن کے نشاں!

تجھے وطن کی نگاہیں سلام کہتی ہیں!

سنگاپور

۱۹۴۵ء

[آم جہرل]

مطبوعہ
اردو پریس ۸۸-میکلوڈ روڈ لاہور